

برونا :- ایک آواز • ایک تحریک



عبدالمجید سندھی اور عیسیٰ خان

آپ کے جریدے مورخہ ۲-۹ جون ۱۹۷۸ء میں جناب احسان عظیم کا مضمون لبطلِ حریت مرحوم شیخ عبدالمجید سندھی کی شخصیت اور وفات پر شائع ہوا۔ ویسے تو مضمون قابلِ تعریف ہے مگر ایک بات جو انہوں نے لکھی ہے اس نے کم از کم میرے دل میں ایک جستجو پیدا کر دی ہے وہ لکھتے ہیں کہ ان کی "بیرونی حملہ آوروں کے خلاف جنگِ آزادی کے ایک سپوت مرزا عیسیٰ خان ترخان کے پہلو میں دفن ہونے کی خواہش تھی۔" انہوں نے عیسیٰ خان کو حریت پسند بھی لکھا ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے سندھ کے لوگ ارغونوں اور ترخانوں دونوں قوموں کو حملہ آور قرار دیتے ہیں یہ لوگ قندھار کے راستے سندھ پر یلغار کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ سندھ میں ایک کہاوت عام ہے کہ سندھ کو ہمیشہ قندھار سے خطرہ رہتا ہے۔"

ہو سکتا ہے کہ حملہ آوروں کی آپس میں جنگ ہوئی ہو اور اس میں عیسیٰ خان کو فتح ہوئی ہو۔ شیخ سندھی مرحوم ایک بڑے مدبر اور تاریخ کے ماہر تھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہوں نے کیسے اپنے مدفن کے لیے عیسیٰ خان ترخان کے مقبرے کا احاطہ پسند کیا۔ ٹھٹھہ اور سندھ کے دوسرے علاقوں میں کئی نامور مجاہدین کی آرام گاہیں موجود ہیں جن میں شہید ہوشو، محمد شہید، دریا خان شہید و دودو سومرو کے نام سرِ فہرست ہیں

میں سندھ کی تاریخ کے ماہرین اور دوسرے اہلِ علم حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائیں میرے خیال میں پیر حسام الدین راشدی، محترم غلام علی الانہ ڈائریکٹر سندھیالوجی، شیخ ایاز اور محترم ابراہیم جویو، ہمیں تاریخی معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تاریخ مسخ ہونے سے نئی نسل کی ذہنی نشو و نما بھی غلط ہوتی ہے

اعجاز علی خواجہ

(میرپور بٹھورو)

سامراج کے خلاف قلمی جہاد

آپ کی جدوجہد کو ہمارا سلام پہنچے ہم جیل کے اندر جب آپ کی تحریریں پڑھتے ہیں تو ہمارے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ آپ کو جس طرح حق کی آواز بلند کرنے کی سزا ملی ہے جس طرح آپ نے اپنے رسالے کے ذریعہ سامراج اور ان کے ایجنٹوں کے خلاف جدوجہد کی ہے ہم آپ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں آپ اس گھٹن میں جس طرح اپنے قلم سے جاگیرداروں سرمایہ داروں اور سامراج کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمارے حوصلے آپ کی تحریروں کی وجہ سے بلند ہو جاتے ہیں۔ مجھے ۲ مارچ کے دن ٹکا خان کے ساتھ لوہاری مسجد کے قریب جماعت اسلامی کے کارکن کی مخبری کی وجہ سے پکڑا تھا پولیس نے مار مار کر زخمی کر دیا۔ ۲۱ مارچ کو فوجی عدالت نے دس کوڑے چھ ماہ قید بامشقت سزا پانچ ہزار روپیہ جرمانہ اور عدم ادائیگی مزید چھ ماہ کی سزا سنا دی۔

میں صحافیوں کو سلام کرتا ہوں جو کہ جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمارے نعرے یہ ہیں۔

دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ
امریکی سامراج مردہ آباد
عظیم چیئرمین ماؤزے تنگ کو سرخ سلام
الفتح کی جدوجہد کو سرخ سلام

کامریڈ مسعود قزلباش

میانوالی جیل

نفرتوں کو نہ بڑھائیے

کبھی میں سوچتا تھا کہ عالمی رائے عامہ بھارت کو کیوں پسند کرتی ہے بھارت کا عالمی وقار کیوں زیادہ ہے پھر مجھے علم ہوا یہ سب ہمارے دشمن نہیں ہیں ہر ملک کی عزت وہاں کی منتخب اور فعال قیادت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ میں نے بھٹو کے دور میں دیکھا۔ چھوٹی سی مثال لیجیے جب پتن (سوات) میں زلزلہ آیا تو ہمیں نہ صرف بہت زیادہ امداد ملی بلکہ تقریباً تمام سربراہانِ مملکت نے پیغامات بھیجے یہ کیا تھا۔! یار لوگ پھر کہیں گے کہ جی وہ امداد تو خرد برد ہو گئی سب کچھ کھا لیا میں کہتا ہوں کہ عوام کو بے وقوف نہ سمجھو، سب کو یاد ہے کہ سیلاب کے موقعہ پر بھٹو نے اعلان کیا تھا کہ ہم کوئی بیرونی امداد قبول نہیں کریں گے اور اس کا عملی مظاہرہ بھی دکھایا۔ اگر وہ اتنے ہی بھوکے اور لالچی ہوتے تو یہ موقعہ اچھا نہیں تھا گیا۔

مگر کیا کریں اسلام کشادہ دلی کی ترغیب دیتا ہے مگر اسلام کے نام نہاد داعی اور علمبردار کھلے دلداری کا مظاہرہ نہیں کرتے یہ نفرتوں کے ان گہرے اندھے کنوئیں میں گرے ہوئے ہیں جہاں سے اچھائیوں اور خوبیوں کی کوئی روشن کرن انہیں دکھائی نہیں دیتی یہ احساسِ کمتری کے مارے لوگ ہیں انہوں نے ہمیشہ عوام کو غم دیئے اور حیرت تو یہ ہے کہ نام نہاد لیڈران قوم تخریب کے لئے کیسے بقول مفتی محمود ۲۳ گھنٹوں میں متحد ہوئے تھے مگر تعمیر کے لیے وہ چوبیس مہینوں تو کیا چوبیس سالوں میں بھی متحد نہیں ہوں گے۔ تعمیر اور یہ لوگ؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

فیصلہ اب عوام پہ ہے ہم یہ ضرور کہیں گے کہ خدارا کچھ اچھائیاں بھی یاد رکھیئے۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ والی بات۔ اب چھوڑیئے نفرتوں کو اور نہ بڑھائیے۔

منظور احمد۔ حیدر آباد

صاحبزادہ فاروق کی وضاحت

آپ کے ہفت روزہ الفتح (راہی) مورخہ ۲-۹ جون ۱۹۷۸ء میں ملتان کی رپورٹ پڑھ کر میں نہ صرف حیرت زدہ رہ گیا بلکہ سخت صدمہ ہوا۔ میرا موقف آپ ہی کے جریدے (۵-۱۲ مئی ۱۹۷۸ء) میں صفحہ ۴۰ پر واضح طور پر شائع ہو چکا ہے۔ میرے موقف میں تبدیلی کیسے واقع ہو سکتی ہے جب کہ میں ہمیشہ اس پر سختی سے قائم رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ عوامی طاقتوں کا ساتھ دیا ہے اور ذاتی فوائد کے لیے کبھی اصولوں کو نظر انداز کر کے سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہ میرا یقین کامل ہے کہ کوئی بھی انتظام یا فارمولہ کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک کے عوام کو اس میں شرکت کا مکمل حق نہ دیا جائے۔ ملک کے موجودہ سیاسی بحران کا واحد حل فوری طور پر عام انتخابات میں مضمر ہے ورنہ صورتحال مزید خراب ہو جائے گی اور صرف عوام کے منتخب نمائندے ہی ملک کو بچا سکتے ہیں

(صاحبزادہ فاروق علی ملتان)

مسائل بڑھ گئے ہیں

ہم سمجھتے ہیں کہ مارشل لا کے نفاذ سے اب تک ہمارا ملک مزید گوناں گوں مسائل کا شکار ہو گیا ہے، طالب علموں، دانشوروں محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں پہ بے پناہ مظالم توڑے گئے ہیں ملک سیاست پر قابض جاگیرداروں اور ان کی پروردہ مطعون نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ سے ہزاروں کی تعداد میں مزدوروں کی چھانٹیاں کی گئی ہیں کسانوں کو جبری بے دخل کیا گیا ہے پٹ فیڈر میں جمالی خاندان کی نہتے کسانوں پر مسلح چڑھائی حالیہ سانحہ سندھ جس میں کسانوں کو بڑی ہی بے دردی سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا خضدار اور تربت میں بی ایس او کے پرامن جلوس پر پولیس کی فائرنگ، کالا باغ میں نوابین کالا باغ کا تین افراد کو اپنی نجی جیلوں میں مقید رکھنا ملتان میں مزدوروں کا قتل عام صحافیوں کی پرامن جدوجہد پر انہیں کوڑوں جیسی غیر انسانی سزائیں۔ سب ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، حکمران طبقے کی سامراج نوازی، جاگیردار دوستی نے اس ملک کے شہریوں کو معاشی بحران میں مبتلا کر دیا ہے روزگار کا عدم تحفظ، مہنگائی، بے روزگاری تعلیمی سہولتوں کا فقدان اور جاگیرداروں و سرمایہ داروں کے لاڈلوں کے لئے ایچی سن جیسے مخصوص تعلیمی ادارے یہ ساری کی ساری باتیں عوام دشمنی کا کھلا ثبوت ہیں۔ ہم پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک میں فوراً انتخابات کرائے جائیں۔ کوڑوں جیسی غیر انسانی سزاؤں کو منسوخ کیا جائے تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط رہا کیا جائے۔ صحافیوں کے مطالبات پورے کیے جائیں۔ اور ترقی پسند طلباء پر رجعت پسند تنظیموں کا تشدد کا سلسلہ روکا جائے، میانوالی کے عوامی بنیادی حقوق ادا کیے جائیں معدنی دولت سے مالا مال اس خطے کے باسیوں کو بھی اچھے شہریوں کا درجہ دے کر تعلیمی اور معاشی سہولتیں مہیا کی جائیں۔

سید الطاف شاہ

سیکرٹری جنرل۔ کالا باغ فرنٹ

پرنسپل کا تبادلہ کیا جائے

لیاقت میڈیکل کالج کے طلباء کا دیرینہ مطالبہ ہے کہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ابراہیم مین کا تبادلہ کیا جائے اس مطالبے کو تسلیم کرانے کے لیے طلباء نے جنرل باڈی کے اجلاس میں قراردادیں منظور کیں۔ بائیکاٹ کیا بھوک ہڑتال تک کی، لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی کیونکہ سیکرٹری صحت پرنسپل کے پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔

محمد عمر سنجرانی۔

ہفت روزہ

راھی

حیدرآباد

جلد: ۸ شمارہ: ۳

۱۶-۲۳ جون ۱۹۷۸ء

قیمت: تین روپے

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

الفتح

پابندی ختم ہونے کے بعد شائع ہوگا

خاصِ مضامین

صحافت دشمن عناصر ایک بار پھر ننگے ہو گئے	وقائع نویس	۶
روس اور پاکستان میں صرف ۹ میل کا فاصلہ ہے	عبدالمجیب خان	۷
بھاگ ان بردہ فروشوں سے	ذوالفقار حیدری	۹
قومی اتحاد لوٹ گیا، یو ڈی ایف رہ گئی	شبیہہ الحسن	۱۱
میر مرتضےٰ بھٹو کا انٹرویو	ریڈیو ٹورنٹو	۱۴
سپریم کورٹ میں جناب بھٹو کی اپیل (آخری قسط)		۲۴

چیف ایڈیٹر:
احمد راھی
پبلشر احمد راھی نے
پاکستان پریس سے
چھپوا کر دفتر ہفت روزہ
راھی ٹاؤن کالج حیدرآباد سے شائع کیا

دفتر رابطہ
الفتح مطبوعات
۶۹-۵ ڈی ترسری کمرشل
پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹
فون ۴۳۲۲۷۴۰

باطل فنا ہونے کے لئے ہے

جس وقت یہ سطور لکھی جا رہی ہیں کراچی میں پی ایف یو جے اور ایپنک اعلیٰ تنظیموں اور صحافیوں کی حالیہ جدوجہد کو منظم کرنے والی مجلسِ عمل کے اجلاس جاری ہیں۔ ان اجلاسوں کی اہمیت سے اخباری صنعت کے کارکن اور ان کے ہمدرد محنت کش طبقات، دانشور اور اہلِ فن ہی واقف نہیں ہیں بلکہ حکومت کے ایوان بھی ہمہ تن گوش ہیں۔ اس پذیرائی کی وجہ یہ ہے کہ اخباری صنعت کے کارکنوں نے سخت ترین آزمائشوں میں بھی اپنی قیادت کے فیصلوں پر عمل درآمد کر کے بے مثال اعتماد کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جدوجہد کے دوران اخباری صنعت کے کارکنوں نے جس استقامت، بے جگری اور پامردی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک قابلِ تقلید مثال اور اس مثال کے قائم کرنے والے دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ خاص طور پر آزادیٔ صحافت اور اس پیشے سے متعلق افراد کے معاشی مطالبات کے لئے کوڑوں کی سزا پانے والے ناصر زیدی، اقبال جعفری، خاور نعیم ہاشمی اور مسعود اللہ خاں جدوجہد کی تاریخ میں ایک علامت کے طور پر سربلند ہوئے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ چند غداروں نے اس تحریک کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی ناکام کوشش کی۔ سرکاری ذرائع ابلاغ ریڈیو، ٹی وی اور بے ضمیر اخبارات نے قوم کو فریب دینے کی ہر کوشش کر کے ناکامی کا منہ دیکھا۔ سنا گیا ہے کہ یہ غدار اب ملک سے باہر یہی ناٹک رچانا چاہتے ہیں۔ اس کا جو انجام ہوگا وہ بھی سب کو معلوم ہے۔

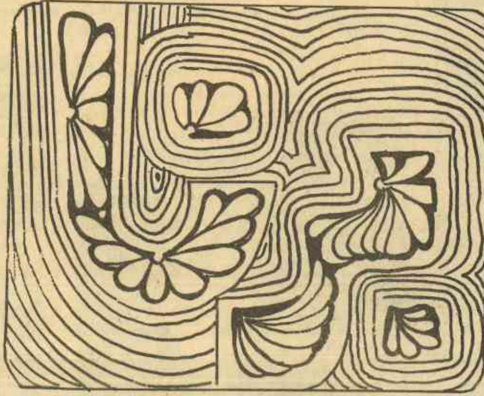
اصل مسئلہ یہ ہے کہ اربابِ اختیار اب تک خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ وہ اب بھی یہ کوشش کر رہے ہیں کہ جھوٹے پروپیگنڈے اور بااصول قیادت اور خاص طور پر منہاج برنا کو طرح طرح سے پریشان کر کے ضمیر فروشی اور بے اصولے پن پر آمادہ کریں۔ ہم ان سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ جھوٹے وقار کے لئے ان ہتھکنڈوں سے باز آ جائیں گے۔ ان کے سامنے صرف وقتی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ اصولی اختلاف کے احترام سے وہ آشنا نہیں۔ استقامت کردار ان کے نزدیک باغیانہ روش ہے۔ انہیں یہ بتانا بھی فضول ہے کہ تاریخ میں صرف اصول اور اصولوں کے لئے قربانی دینے والے زندہ رہتے ہیں۔ ہر آنے والے کی مدح سرائی اور جانے والے کی ہجو کرنے والے وقت کے دھارے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں اگر کوئی بچ بھی جاتے تو لعنت و ملامت کی علامت بن کر رہتا ہے۔

آج بھی صورتِ حال یہ ہے کہ مساوات کراچی کی اشاعت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہیں۔ الفتح اور معیار پابند ہیں۔ جدوجہد میں حصہ لینے کی سزا کے طور پر کئی صحافیوں سے رزق کا وسیلہ چھین لیا گیا ہے۔ اخبارات و جرائد کے خلاف کارروائیوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی یہ سمجھے کہ تحریک ختم ہو جائے گی تو اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کچھ لوگ آئینوں پر بدصورتی کا الزام دھر کر خوش ہوتے ہیں۔ انہیں یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اَنا کی تسکین کی کیا قیمت ادا کر رہے ہیں۔

برنا، ایک آواز
ایک تحریک

نمائندہ خصوصی





متحدہ پاکستان میں دونوں بازوؤں کے درمیان سنگم ثابت ہوئے

بونے پراپیگنڈے کے ذریعے برنا کو شکست نہیں دے سکتے

انہیں یہ مقام

جدوجہد نے دیا ہے

سرکاری سرپرستی نے نہیں

★ یونان کی عدالت نے ستر سالہ بوڑھے سقراط کو "کفر اور غداری" کے الزام میں موت کی سزا دی، سقراط نے زہر کا پیالہ ہنسی خوشی پیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں حق پر ہوں۔ دنیا آج سقراط کی تعلیمات کو آنکھوں سے لگاتی ہے۔ اور دلوں میں جگہ دیتی ہے البتہ سقراط کے قاتلوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

★ عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا۔ کیونکہ وہ مفلسوں اور محتاجوں کی دلجوئی کرتے تھے۔ استحصالی طبقوں کو سماج دشمن سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ کسی دولت مند کا جنت میں جانا اتنا ہی دشوار ہے جتنا اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا۔ عیسیٰ کو صلیب دینے والوں کو آج کوئی نہیں جانتا البتہ عیسیٰؑ کی تعلیمات آج بھی کروڑوں انسانوں کے لئے چراغِ راہ ہیں۔

★ بغداد کی گلیوں میں حسین بن منصور حلاج نے "اَنَا الحق" (میں تخلیقی صداقت ہوں) کا نعرہ لگایا تو قاضی نے اسے موت کی سزا دی۔ پہلے اسے ایک ہزار دُرّے مارے گئے اس کے بعد ہاتھ پاؤں کاٹے گئے پھر بغداد کے جیل کے میدان میں اسے دار پر لٹکایا گیا لیکن قاتلوں کو اس پر بھی چین نہ آیا۔ منصور کی لاش کو سرِ بازار لٹکایا گیا۔ اور پھر لاش کو جلا کر راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی گئی۔ اس واقعے کو گیارہ سو برس گذر چکے ہیں منصور آج بھی زندہ ہے وہ قربانی اور حق گوئی کی علامت ہے اور اُس کے قاتلوں کا نام ایک گالی بن چکا ہے۔

سلام ہو، پی ایف یو جے اور ایپنک کو، اُن کے قائدین کو، ننگی پیٹھوں پر کوڑے کھانے والوں" ناصر زیدی، اقبال جعفری اور خاور ہاشمی اور کوڑوں کی سزا پانے والے مسعود اللہ خان کو، جو سقراط، عیسیٰؑ اور منصور کی روایات کے امین ہیں۔ جنہوں نے اِن مقدس روایات کو جلا بخشی۔ حدیثِ نبویؐ "بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے"، پر عمل کیا۔ بلاشبہ بعض اخباری کارکنوں نے سرکاری اخبارات (این پی ٹی) کی ملازمت کی تھی لیکن اس وفاداری کی قیمت پر نہیں جو انہیں اپنے وطن سے ہے اور آزادئ صحافت کی قیمت پر نہیں جو ان کا مزاج ہے اخباری کارکنوں نے جن قائدین کی قیادت میں آزادئ صحافت کی تحریک کا آغاز کیا ان اجداد کے فرزند ہیں جنہوں نے اپنے وقار اور آزادی کے لیے فرنگیوں کے خلاف مورچے لگائے تھے منہاج برنا کے والد نے کراچی کے خالق دینا ہال میں فرنگی حاکم کے سامنے فوجی بھرتی کی اس وقت مخالفت کی، جب ہندوستانی فوج خانہ کعبہ پر گولیاں چلا رہی تھی اور "نظریہ پاکستان" کے ٹھیکے دار اور "مفکر اسلام" مودودی فرنگیوں سے مال توڑ رہے تھے۔ برنا کے والد محترم نے یہ نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ تو فرنگی حاکم نے اس وقت انہیں چوبیس گھنٹوں کے اندر کراچی سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ نثار عثمانی کے اجداد نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اتنا بھرپور حصہ لیا تھا کہ برطانوی ہند کی حکومت نے اعلیٰ سول عہدوں اور فوج میں اس خاندان کے افراد کی تقرری ممنوع قرار دے دی تھی۔

نیرنگیٔ دوراں تو دیکھیے کہ مجاہدینِ آزادی کی اولاد کو وہ بیوروکریسی سزاوار قرار دے رہی ہے جو آزادی سے قبل فرنگی آقاؤں کی جوتیاں سیدھی کرتی تھی جوتے چاٹنے کو باعث اعزاز سمجھتی تھی اور اپنے آقاؤں کے حکم سے خانہ کعبہ پر چڑھائی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی اس بیوروکریسی کے بارے میں برطانوی ادیب کیتھ بچانن اپنی کتاب دی ساؤتھ ایسٹ ایشین ورلڈ" (مطبوعہ لندن، ۱۹۷۷ء صفحہ ۸۰) میں لکھتا ہے،

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

اخباری کارکنوں کی تاریخی جدوجہد



حفیظ راقب



منہاج برنا



نثار عثمانی



احفاظ الرحمٰن

صحافت دشمن عناصر ایک بار پھر ننگے ہو گئے

وقائع نویس

سرکاری ابلاغِ عامہ کے ذرائع ٹرسٹ کے اخبارات اور جماعت اسلامی کے تین ڈھنڈورچی اخبارات یعنی روزنامہ جسارت، ہفت روزہ زندگی اور بادبان کے تمام جھوٹے اور گمراہ کن پروپگنڈے کے باوجود اب یہ حقیقت عوام پر پوری طرح آشکار ہو چکی ہے کہ ساوات لاہو چار غداروں کے ٹولے اور حکومت کے سمجھوتے کے نتیجہ میں نہیں بلکہ اخباری کارکنوں کی ملک گیر پُرامن اور منضفانہ بھوک ہڑتال کی جدوجہد کے منطقی نتیجہ کے طور پر بحال ہوا ہے جو ملک بھر کے پونے دوسو سے زیادہ اخباری کارکنوں نے قید بامشقت، کوڑوں اور غیر قانونی برطرفیوں کو برداشت کرکے پیش کی ہیں۔

اِن چار کے ٹولے بالخصوص رشید صدیقی، ارشید چودھری اور نسیم الحق عثمانی سے پوچھیے کہ انہوں نے ۱۹، اور ۲۰ مئی کو لاہور پریس کلب میں یہ اعلان کرنے کے بعد کہ وہ تو ایپنک اور پی ایف یو جے کے سرکردہ رہنماؤں پر مشتمل مذاکراتی ٹیم ہی سے مذاکرات کرنے کے لیئے حکومت سے کہیں گے؟ انہوں نے کیوں نام نہاد مذاکرات میں شرکت کی اور کیوں حکومت کے تیار کردہ ایک سمجھوتے پر دستخط کیئے جو ایپنک اور پی ایف یو جے کے بنیادی موقف ہی کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چار کا ٹولہ اس نام نہاد سمجھوتے پر دستخط کرکے اس موقف کا حامی ہو گیا ہے کہ کوئی حکومت کسی بھی اخبار کو کالے قوانین کے تحت من مانے الزامات لگا کر بند کر سکتی ہے۔ ایڈیٹروں کو جیلوں میں ڈال سکتی ہے اور اخباری کارکنوں کا یہ فرض ہو گا کہ متعلقہ اخبار اور ایڈیٹروں پر الزامات کو کسی عام عدالت میں ملک کے عام مروجہ قوانین کے تحت ثابت کیئے بغیر ان الزامات پر اپنی مہر تصدیق ثبت کردیں اور استغاثہ کے گواہ بن جائیں ان چار کے ٹولے نے نہ صرف تنظیمی طور پر ایپنک اور پی ایف یو جے سے غداری کی ہے بلکہ آزادیٔ صحافت کے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اصولوں کو خیر ٹکوں کے لیئے فروخت کردیا ہے اور ان اصولوں کو بیچنے میں ایک نام نہاد اسلام پسند سیاسی جماعت یعنی جماعت اسلامی اور اس کے ڈھنڈورچی اخبارات سب سے زیادہ پیش پیش ہیں یہ وہی جماعت ہے جو جمہوریت اور آزادیٔ صحافت کا نعرہ لگاتی تھکتی نہیں تھی جو خود کو رسوائے زمانہ پریس آرڈیننس، ڈی پی آر اور اس نوع کے غیر معمولی سیاہ قوانین اور اس کے تحت قائم کی گئی نام نہاد خصوصی عدالتوں اور ان کے تحت اقدامات اور فیصلوں کو آمرانہ کارروائیاں قرار دیتی تھی جس نے ۳۲ نکات میں اِن اصولوں کا دم بھرا تھا۔ لیکن آج یہ سمجھ کر کہ مارشل لاء حکومت اس کی اپنی حکومت ہے لہذا وہ ان تمام آمرانہ اقدامات کو جو بھٹو یا اس سے پہلے کی حکومتوں کے ادوار میں کیئے گئے تھے۔ آج جائز قرار دے رہی ہے وہ صرف اپنے لیئے جمہوریت، اپنے لیئے آزادیٔ صحافت، اپنے لیئے اختلاف اور تنقید کی آزادی کی قائل ہے اپنے مخالفین کے لیئے نہیں۔

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

روس اور پاکستان میں صرف 9 میل کا فاصلہ ہے

افغانستان کا انقلاب سیاست کا رخ بدل گیا ہے

عبدالمجیب خان

۲۰ مارچ ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے اس وقت کے وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے پاکستان کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"پاکستان ایشیاء اور مشرق وسطیٰ میں ایک خصوصی اسٹریٹجک اہمیت رکھتا ہے اور جس کی وجہ سے یہ عالمی امور میں ایک اہم مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے۔ پاکستان دولت مشترکہ کا رکن ہے لہٰذا مغربی جمہوریتوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کو فروغ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے ساتھ بھی ہمارے سیاسی اور مذہبی رشتے مستحکم بنیادوں پر قائم ہیں۔ لہٰذا پاکستان مسلم ملکوں اور مغربی جمہوریتوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان ایک ایسے مخصوص جغرافیائی مقام پر آباد ہے جہاں سے یہ مسلم دنیا اور ایشیا کے درمیان ایک پل کا کام کر سکتا ہے۔ ہم ایک ایسی حکمت عملی کی پوزیشن پر آباد ہیں کہ ہمیں نہ صرف اپنے عوام بلکہ اپنے دوستوں کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرنا ہے۔"

۱۹۵۴ء میں محمد علی بوگرہ نے جس عالمی صورتحال کے پس منظر میں جنوبی ایشیا میں پاکستان کی اہم پوزیشن کا تذکرہ کیا تھا۔ اس میں اب قدرے تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان کے دونوں بازو متحد تھے اور اس لحاظ سے پاکستان جنوب مشرقی ایشیا میں بھی ایک خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔ عالمی سیاست میں "سرد جنگ" کی کشیدگی اپنے عروج پر تھی۔ محمد علی بوگرہ جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے خصوصی اسائنمنٹ پر پاکستان میں وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ ہندچینی میں امریکی جارحیت قوم پرستوں کی جدوجہد آزادی کا قلع قمع کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ امریکہ جو کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے فوجی معاہدات پر مشتمل بند باندھ رہا تھا۔ اس میں ہندوستان کی جانب سے دو ٹوک جواب مل جانے پر پاکستان کی حمایت حاصل کرلی۔ اور پاکستان تھا اس علاقہ میں امریکہ کے "چوہدری" کی حیثیت سے کمیونزم کے خلاف امریکی اقدامات کو تقویت بخشنی شروع کر دی۔ جبکہ ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے اس بات کی وضاحت کہ اس علاقہ میں آباد ملکوں کو کمیونزم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل خطرہ "نوآبادیت" سے ہے۔ جو نوآباد ملکوں پر ایک بار پھر اپنی بالادستی قائم کرنے کے جال بچھا رہی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ علاقائی اور عالمی سیاست میں تبدیلی آتی گئی۔ امریکہ کو ہندچینی میں منہ کی کھانی پڑی اور بالآخر چین کی جانب دوستی کا ہاتھ بھی بڑھانا پڑا۔ پاکستان جو اس علاقے بلکہ دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی بھی انقلابی تبدیلی کے بعد پہلے امریکی ردعمل کا انتظار کرتا تھا پھر اس کے بعد اپنی رائے کو متعین کرتا تھا۔ اس تبدیلی کے بعد اپنی ہی برادری کے ملکوں سے کٹ گیا۔ یہ سب کچھ پاکستان میں غیر سیاسی اور غیر منتخب حکومتوں کے دور کی روئداد ہے۔ جو اب ہماری تاریخ کا ایک اہم باب بن چکی ہے اور جس کے نتیجے میں ۱۹۷۱ء میں پاکستان ٹوٹ گیا اور یہ سیاہ ترین داغ بھی ہماری سیاسی تاریخ میں ایک نئے باب کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔

لیکن پاکستان جس نے "سرد جنگ" کے دوران امریکہ کے ایک وفادار اتحادی کی حیثیت سے اس کے مفادات کے محافظ کا کردار ادا کیا۔ اور اپنے قریب ترین بڑے ملکوں کی دشمنی بھی مول لی۔ اسے ۱۹۷۱ء میں بچانے کوئی نہیں آیا۔ پاکستان جل رہا تھا۔ پاکستان کی سلامتی پگھل رہی تھی۔ پاکستان کا استحکام دھواں بن کر بادلوں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ لیکن امریکی فوجی معاہدے سیٹو اور سنٹو وہائٹ ہاؤس کی فائلوں میں دبے رہ گئے۔ اور پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے۔

۱۹۷۱ء کے اس عظیم المیہ کے بعد جناب بھٹو نے

علاقائی سیاست کا مرکز اسلام آباد سے دہلی شفٹ ہو گیا ہے

پاکستان کی باگ ڈور سنبھالی۔ ماضی کے تجربات اور علاقائی اور نئی عالمی سیاسی صورتحال کے پیش نظر پاکستان کے سیاسی کردار کی از سر نو سمت متعین کی گئی۔ سیٹو اور دولتِ مشترکہ سے علیحدگی اختیار کی گئی۔ اور پاکستان کی قسمت کو ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ملکوں سے وابستہ کیا۔ امریکہ اور مغربی صنعتی ملکوں پر بہت زیادہ اقتصادی انحصار کو محدود کر کے سوشلسٹ ملکوں سے بھی اقتصادی تعاون کے رشتے قائم کیے۔ اور تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ دوطرفہ بنیادوں پر تعلقات کو فروغ دیا۔ جناب بھٹو تیسری دنیا کے وہ پہلے رہنما تھے جنہوں نے ہند چینی کی جنگ کے بعد، ویتنام اور شمالی کوریا کا پہلا سرکاری دورہ کیا۔ اور ان ملکوں کے سرکاری دورے میں جناب بھٹو کا شاندار تاریخی استقبال کیا گیا۔ مغرب کے سیاسی حلقے جناب بھٹو کی اس پالیسی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ خود امریکہ میں پاکستان اور فرانس کے درمیان ری پروسیسنگ پلانٹ کے معاہدے پر شدید مخالفت بڑھتی جا رہی تھی۔

جناب بھٹو کی اس پالیسی سے نہ صرف ایشیا میں بلکہ پوری دنیا میں پاکستان کو ایک خصوصی اہم مقام حاصل ہو گیا۔ عالمی سیاست میں پاکستان کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔ اور خاص کر تیل کی سیاست کے اہمیت اختیار کر جانے کے بعد بحرِ ہند کی سیاست میں پاکستان کی فوجی حکمت عملی کو اور زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ جس کی وضاحت جناب بھٹو نے ۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء کو پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی کہ:

"جغرافیائی طور پر پاکستان کی پوزیشن بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ہمیں جو بھی فوائد یا نقصانات مل سکتے، ہیں ان کا تعلق اسی فوجی اہمیت کی پوزیشن سے ہے۔ پاکستان کے جنوب میں بھارت ہے۔ جو بہت بڑا ملک ہے۔ مشرق میں بعض دوسرے ممالک ہیں جن میں برما، بنگلہ دیش، بھوٹان ملائیشیا اور انڈونیشیا شامل ہیں۔ پھر مغرب میں افغانستان ہے جو اہم ملک ہے۔ پھر ایران ہے وہ بھی اہم ملک ہے۔ چین کے ساتھ ہماری ۳۵۰ میل طویل سرحد ملتی ہے۔ جو فوجی اہمیت کی حامل سرحد ہے۔ جہاں سنکیانگ کا صوبہ ہے۔ جو ہمارے شمالی علاقوں سے ملتا ہے۔ روس اور پاکستان میں صرف ۹ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ کاریڈور واخ کہلاتا ہے۔ پھر ہمارے مغرب میں متحدہ عرب امارات اور اومان اور دوسری ریاستیں ہیں۔ اسی جانب سعودی عرب ہے۔ پھر جنوب مغرب میں بحیرۂ روم یونان وغیرہ ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان کی پوزیشن بڑی اہم ہے۔ خدانخواستہ اگر پاکستان کو نقصان پہنچا تو مشرقی محاذ، مغربی محاذ اور عرب محاذ کی طرف بڑی خراب صورتحال پیدا ہو جائے گی اور اگر پاکستان مستحکم اور مضبوط ہوا تو صورتحال مختلف ہو گی۔ پاکستان کمزور رہا تو متحدہ عرب امارات، اومان اور سعودی عرب کی پیٹھ میں چھرا گھونپا جا سکتا ہے۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت"

لہٰذا پاکستان کی اس فوجی اہمیت کی پوزیشن کے پیش نظر سامراجی اور صیہونی قوتیں اسے کبھی ایک مستحکم اور طاقتور ملک کی حیثیت سے ابھرنے نہیں دیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوتیں پاکستان میں ری پروسیسنگ پلانٹ کی تنصیب کے منصوبے کو منسوخ کرانا چاہتی ہیں کیونکہ اس منصوبے کی تکمیل کے بعد پاکستان عالم اسلام اور خصوصاً مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں کے لیے قوت کا ایک ذریعہ بن جائے گا۔

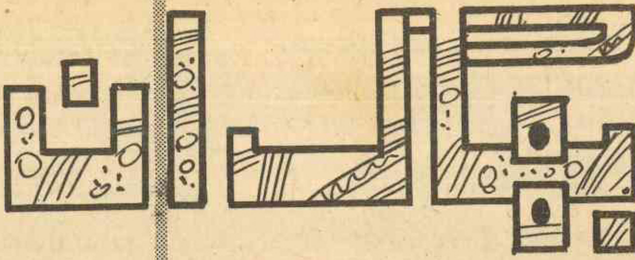
امریکہ میں جب بھی ڈیموکریٹک پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے دنیا کا امن خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اور محاذ آرائی کی کیفیت میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں صدر کینیڈی برسرِ اقتدار آئے تو عالمی محاذ آرائی اس وقت سنگین صورت اختیار کر گئی جب کیوبا کے بحران میں امریکہ نے براہ راست مداخلت کی۔ دھمکی دے کر امن پسند قوموں کے لیے تشویش پیدا کر دی۔ اس وقت روس اور امریکہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھے۔ ہند چینی میں پہلے ہی امریکی جارحیت علاقہ کا امن کو تہہ و بالا کیے ہوئے تھی لیکن جب ریپبلکن پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے تو عالمی کشیدگی میں بڑی حد تک کمی محسوس کی جانے لگتی ہے۔ صدر نکسن نے ویت نام کی جنگ میں شکست کے بعد ایک طرف چین سے تعلقات استوار کیے تو دوسری جانب روس کے ساتھ "دیتاں" کی پالیسی کے تحت پُرامن بقائے باہمی پر مبنی تعلقات استوار کیے۔ صدر فورڈ کے دور میں بھی عالمی محاذ آرائی کی کیفیت بڑی حد تک محدود رہی لیکن ایک بار پھر امریکہ میں ڈیموکریٹک پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد عالمی محاذ آرائی بلکہ صدر جمی کارٹر نے روس پر اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ "امریکہ محاذ آرائی کے لئے بھی تیار ہے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیسری عالمی جنگ امریکی ڈیموکریٹک پارٹی کی انتہا پسند پالیسیوں کے نتیجے میں شروع ہو گی۔

امریکہ کی ڈیموکریٹک پارٹی نے ہمیشہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کو اس علاقے میں خصوصی ترجیح دی ہے۔ صدر کینیڈی نے برسرِ اقتدار آتے ہی اپنے نائب صدر جانسن کو برصغیر کے دورے پر بھیجا کہ ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو ان کا پیغام پہنچائیں کہ وہ اس علاقے کی قیادت سنبھال لیں۔ اس کے علاوہ صدر کینیڈی نے پاکستان کی اقتصادی اور فوجی امداد میں بھی کمی کرنے کا حکم دیا گو کہ پاکستان امریکہ کے وفادار اتحادیوں میں شامل تھا۔ امریکہ کا اتنا سعادت مند تھا کہ بغیر وہائٹ ہاؤس کی منظوری کے چین سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ لیکن افسوس اس کے صلے میں پاکستان کو ۱۹۷۱ء میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور اب بھی امریکہ پاکستان کو ہندوستان کے مقابلے میں اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے خوشحال دیکھنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ وہ ری پروسیسنگ پلانٹ کے معاہدے کو منسوخ کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے اور پاکستان میں پہلے اسٹیل مل کے پروجیکٹ کو ناکام بنانے کی سازشیں بھی کر رہا ہے۔ امریکہ یہ بھی کبھی نہیں چاہے گا کہ پاکستان مسلم دنیا کی سرگرم قیادت کرے۔

امریکہ میں ڈیموکریٹک پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پاکستان کے ہمسایہ ملکوں کے سیاسی حلقے اور خود پاکستان کے بعض سیاسی حلقے اس بات کی پیشین گوئیاں کر رہے تھے کہ اب جناب بھٹو کا زیادہ عرصہ برسرِ اقتدار رہنا مشکل ہے کیونکہ جناب بھٹو کی آزاد خارجہ پالیسی، تیسری دنیا کے اتحاد کی باتیں، اسلامی ملکوں کے اتحاد کو استحکام بخشنے کی کوششیں، ری پروسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ، سوشلسٹ ملکوں سے اقتصادی اور سیاسی تعلقات کا فروغ اور پھر پاکستان کا بڑھتا ہوا عالمی وقار جس نے علاقائی سیاست کا رخ دہلی سے اسلام آباد کی جانب موڑ دیا۔ چنانچہ یہ تمام تر صورتِ حال امریکہ اور خصوصاً امریکی ڈیموکریٹک پارٹی کو ناپسند تھی۔ لہٰذا پاکستان کو اپنی حدود میں رکھنے کی غرض سے ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات سے دائیں بازو نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سامراجی اور صیہونی ذرائع ابلاغ عامہ نے پی این اے کی تحریک میں خصوصی کردار ادا کیا۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو پاکستان میں تیسرا مارشل لا

(باقی صـ۴۲ پر)



بردہ فروشوں سے

اسلام آباد

ذوالفقار چیمہ

صحافیوں کی موت، معاوضے کی ادائیگی اور دوہرے معیار

پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں اب اس واحد مطالبے پر متفق ہوتی جا رہی ہیں کہ مارشل لاء انتظامیہ ملک میں جلد سے جلد عام انتخابات کرائے اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو سونپ دیا جائے۔ سیاسی جماعتوں کو اس واحد مطالبے پر پہنچنے کے لیے ایک سال کا عرصہ لگا ہے پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور احمد نے کراچی میں اخبار نویسوں سے بات چیت کے دوران مطالبہ کیا کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر انتخابات کے انعقاد اور اقتدار کی منتقلی کے پروگرام کا غیر مبہم اعلان کریں اور فوج اور سول انتظامیہ کا دوہرا انتظام ختم کرکے انتخابات کے بارے میں ٹھوس اقدامات کرکے عوام کے شبہات کو دور کیا جائے انہوں نے ملکی حالات کی اصلاح کے لیے پانچ نکاتی پروگرام بھی تجویز کیا ہے تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان پہلے ہی جلد انتخابات کرانے کا مطالبہ کرتی رہی ہیں انتخابات جلد کرانے کا مطالبہ پاکستان پیپلز پارٹی کے خود ساختہ چیرمین اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار مولانا کوثر نیازی نے بھی کیا ہے پاکستان پیپلز پارٹی کی اصلی قائمقام چیرمین مسز نصرت بھٹو بھی جلد از جلد انتخابات کے مطالبہ کو شروع سے ہی دہرا رہی ہیں. گویا کوئی قابلِ ذکر جماعت ایسی نہیں ہے جس کا اس وقت یہ مطالبہ نہ ہو کہ انتخابات کرا کے اقتدار اس کے منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے۔ اس واحد مطالبہ پر مارشل لاء انتظامیہ تاحال خاموش ہے اور اس خاموشی کو طوالت دے رہی ہے عبوری حکومت جن حالات میں منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار میں آئی تھی ان حالات میں ملک بھر کے عوام نے حکومت کے اس واحد مقصد سے ہم آہنگی کر لی تھی کہ وہ انتخابات کرا کے اقتدار منتخب افراد کے حوالے کر دے گی. لیکن انتخابات کا وعدہ ٹلتے ٹلتے اب اس مرحلہ پر آن پہنچا ہے کہ سوائے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کے اور کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ انتخابات ہونگے بھی یا نہیں۔ اور ہونگے تو کب ہونگے. جنرل صاحب کے منیر انتخابات کے لیے جس شیڈول کا اعلان کرتے پھرتے ہیں اس کی روشنی میں تو عام انتخابات ۱۹۸۱ء سے پہلے کسی بھی صورت ہوتے نظر نہیں آتے اور یہی بات جنرل ضیاء الحق صاحب نے بھی باوثوق ذرائع کے مطابق مختلف سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کے دوران کہی ہے۔ پاکستان میں عام انتخابات کرائے بغیر نہ تو استحکام آسکتا ہے اور نہ ہی جمہوریت کسی بھی شکل میں بحال ہو سکتی ہے. پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جو ایک سیاسی مطالبے کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا پوری قوم نے اپنے رہنماؤں پر اعتماد کیا اور ان کے اس مطالبے پر لبیک کہا کہ پاکستان کا مطلب کیا. لا الٰہ الا اللہ۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ پاکستان بننے کے بعد عرصہ دراز تک عام انتخابات نہیں کرائے گئے. مختلف افراد اپنے ذاتی فوائد کے لیے ملک کی اس اساس کو کمزور کرتے چلے گئے. وہی لوگ اب

بھی موجود ہیں کہ ان لوگوں کی ایک خاص نسل ہوتی ہے۔ یہ لوگ آج بھی پاکستان کو اس کی اصل سے دور کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملک میں عام انتخابات نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو اس وقت ہرگز نہ ہوں کہ اس صورت میں ان کے لیے اقتدار کے ایوان میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ پاکستان اپنی تاریخ کے جس دور سے اس وقت گزر رہا ہے اس میں اگر ہم نے اپنے ذاتی مفادات کو اسی طرح مدنظر رکھا اور قومی مفادات کو پس پشت ڈالا تو آنے والی نسلیں اور تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ وقت کے دھارے کو بہنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور جس نے بھی اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی ہے وہ خس وخاشاک کی طرح بہہ گیا ہے اگر اب بھی ہم نے اپنی آنکھیں نہ کھولیں تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہو۔

ایوب خان نے جب مارشل لاء کا تخت چھوڑا اور تختِ حکومت پر براجمان ہوئے تو اسی وقت ان کی ضرورت لاہور کا ایک ایسا شخص بن گیا جس کا دین مذہب کوئی نہیں تھا اور جو اسی برتن میں چھید کرنے کے اصول پر کاربند تھا جس میں کھاتا تھا اور جسے ہم سب اس وقت مولانا کوثر نیازی کے نام سے جانتے ہیں ایک زمانے میں جو برجی سے شاہ عالمی بازار تک تانگے میں دو آنے سواری کے حساب سے آتے۔ دوپہر کو کھانے کی جگہ ایک آنے کی چھولے کی پلیٹ سے پیٹ بھرتے اور شام کو ٹہلتے ٹہلتے گھر جانے والا یہ شخص جب وقت کے حکمران کی ضرورت بنا تو تقدیر اس پر کھل کر مہربان ہو گئی جو شخص زندگی بھر مولانا مودودی کے معصرین میں شمار نہ ہو سکا تھا وہ ان کے منہ آنے لگا۔ ایوب خان کے بعد یہی شخص یحیی خان کی ضرورت بنا اور پھر اسے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت میں مستقبل شاندار نظر آنے لگا تو وہ ان کے ہمراہ نتھی ہو گیا۔ اس نے جماعت اسلامی سے نکلنے کے بعد مولانا مودودی کو برا بھلا کہا۔ ایوب خان کا لمبا ہی ساتھ دیا اور جب قدرت ان پر مہربان نہ رہی تو ایوب خان پر نکتہ چینی کرنے لگا تھا۔ یحیی خان پر بھی اس نے پتھر پھینکے۔ اور مسٹر بھٹو کی قدم بوسی شروع کر دی اس ابن الوقت انسان سے ہوشیار رہنے کے لیے بہت سے لوگوں نے مسٹر بھٹو کو کہا۔ جب مسٹر بھٹو کے اقتدار کا سورج گہنا گیا تو اب یہی شخص ان پر سنگ زنی میں مصروف ہے لاہور کے ایک ہفت روزہ سے بات چیت کے دوران اصل بات بھی ان کے منہ سے نکل ہی گئی ہے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں سیاست میں خلوص کم ہی پایا جاتا ہے یہ لوگ مسٹر بھٹو کے نام پر مہم چلا کر دراصل پاکستان میں مسٹر بھٹو کے ووٹروں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بس۔ مصطفیٰ کھر سے نصرت بھٹو تک سبھی سیاسی ہیں ان میں اکثر رشتے سیاسی مقاصد کے لیے رہتے ہیں یہاں رنجشیں یا دوستیاں کام نہیں آتیں۔ اس خود غرضانہ سیاست میں اپنی دکان چمکانے کیلئے ایک بھائی دوسرے بھائی کا گلا کاٹتا ہے بیوی شوہر کی جان لے سکتی ہے۔ اور بیٹا باپ کی گردن پر چھری رکھ دیتا ہے جن لوگوں کی منزل ہر قیمت پر اقتدار ہو ان میں اخلاقی اقدار کہاں آ سکتی ہیں۔ کوثر نیازی کا یہ جواب ان کے اپنے کردار کی شاندار تصویر ہے وہ خود معترف ہیں کہ اقتدار کی خواہش کرنے والوں میں اخلاقی اقدار کہاں ہیں۔ ایک بار پھر ایوانِ اقتدار میں داخلے کے لیے کوثر نیازی نے مسٹر بھٹو کو جن کو وہ آج بھی اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں داؤ پر لگا دیا ہے ان پر ایک ہی شعر صادق آتا ہے جو ہم مسٹر بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی نذر کرتے ہیں۔

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں گر یوسف سا برادر پائیں

کوثر نیازی نے یقیناً وسیع معاہدہ کیا ہے وہ اس وقت برادران یوسف کا کردار ادا کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس بات کو ثابت کرنے پر بھی کہ اصل کردار ہی یہ ہے اس انٹرویو میں اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ کی نظر میں مسٹر بھٹو کے دوبارہ اقتدار میں آنے کا کوئی امکان ہے فرماتے ہیں میرے خیال میں شخصی طور پر ان کی سیاست ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے البتہ ان کے خیالات اور نظریات کو جو پاکستان کے عوام کے لیے فائدہ مند تھے کو نیا سفر شروع کیا جا سکتا ہے مولانا کوثر نیازی نے یہ نیا سفر اب اپنی قیادت میں شروع کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔

مولانا کوثر نیازی کی طرح کی ہی ایک اور شخصیت بھی یہاں موجود ہے جو یحیی خان کے دور سے کر اب تک بلکہ ایوب خان کے زمانے جس حکومت کی ضرورت بنی رہی ہمارا اشارہ موجودہ منسٹر پلاننگ مسٹر محمود علی کی طرف ہے ایوب کے بعد یحیی، یحیی کے بعد بھٹو اور بھٹو کے بعد اب جنرل ضیاء الحق صاحب کی فہرست میں موصوف بڑے طمطراق سے شریک ہیں خود کو پاکستان، نظریہ پاکستان کا امین سمجھتے ہیں اگر واقعی کچھ ہوتے تو نجانے کیا کرتے اردو زبان بڑی وسیع ہے اور اس میں اس شہر کے موقع پرست اور ابن الوقت لوگوں کے لیے بڑی اصطلاحیں ہیں ایسے لوگوں کو طوطا چشم بھی کہا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں ٹریفک کے ایک حادثے میں راولپنڈی کے ایک صحافی کاظم نقوی اور ان کے ماموں زاد بھائی نظر سہیل جاں بحق ہو گئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے مرحوم صحافی کے اہل خاندان کے لیے دس ہزار روپے کی رقم کا عطیہ دیا اور جی ٹی ایس پشاور کے حکام سے کہا کہ وہ بھی معاوضہ کی رقم جلد از جلد مرحوم صحافی کے اہل خانہ کو دیں۔ چنانچہ اگلے روز ۱۶ ہزار کا ایک اور چیک مسٹر نقوی کے اہل خانہ کو مل گیا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ذاتی عملے کے افراد سے ایک اخبار نویس نے پوچھا اس حادثہ میں دو افراد جاں بحق ہوئے تھے مگر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی امدادی رقم اور معاوضہ کی رقم صرف مرحوم صحافی کو ہی کیوں دی جا رہی ہے جبکہ دوسرا بھی نوجوان تھا ان صاحب نے جواب دیا ہم نے ہر شخص کے مرنے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے پوچھنے والے صحافی نے پوچھا۔ اچھا تو آج کل آپ کے پاس صرف صحافیوں کے مرنے کا ٹھیکہ ہے افسر جھنجلا گئے بولے اچھا یوں ہی سمجھ لو۔ اس حادثے میں مرنے والا دوسرا نوجوان نظر سہیل کراچی کے ماہر تعلیم کا اکلوتا لڑکا تھا اس کے والد کو مسٹر بھٹو کے دور میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ نظر سہیل نے ایئر فورس کی ملازمت چھوڑ کر بہتر ملازمت کی تلاش میں پی آئی اے میں درخواست دی تھی مگر موت نے اس کو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ اپنے اہل خانہ کے لیے بہتر مستقبل تلاش کر سکے۔ بوڑھے باپ اور بوڑھی ماں کی آمدنی کا ذریعہ کوئی نہیں ہے کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایک اخبار نویس کے مرنے کے ساتھ ساتھ اس جوان کے اہل خانہ کو بھی اسی قدر امدادی رقم فراہم کی جاتی اور اسے بھی معاوضہ کی رقم جلد ادا کر دی جاتی یہ درست ہے کہ آجکل صرف صحافیوں کے مرنے کا ہی ٹھیکہ لیا ہوا ہے مگر جب مساوات کا ایک نمائندہ شیخوپورہ میں مرا تو اسی حکومت میں ایک مولوی نے اس کا جنازہ اس لیے پڑھانے سے انکار کر دیا کہ وہ مسٹر بھٹو کا حمایتی تھا اس صحافی کو بھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی جانب سے امداد ملنی چاہیئے تھی۔ امداد کرنے والے اور جذبہ ہمدردی رکھنے والے اپنے اس جذبہ کو نہ تو محدود کرتے ہیں اور نہ ہی مشروط ہماری دعا ہے کہ اگر خدا کسی کو صاحب حیثیت اور صاحب اقتدار کرے تو صاحب حوصلہ بھی ضرور کرے۔ (آمین ثم آمین)



قومی اتحاد ٹوٹ گیا
یو۔ڈی۔ایف رہ گئی

ملک، قوم اور مسلح افواج کے وقار کو نقصان پہنچا ہے



سوچا تھا اقتدار مقدر بن گیا انتشار

شبیہ الحسن

قومی اتحاد کے جال سے تحریک استقلال اور جمعیت العلمائے پاکستان کے نکلنے کے بعد اب عملاً اس کے وجود کی اہمیت اور ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ کیونکہ انتخاب کے اصولی مطالبہ سے دستبردار ہونے کے بعد اتحاد کی بچی کھچی پارٹیوں کی ساکھ اس قدر متاثر ہوئی ہے کہ کسی بھی مسئلہ پر مولانا مفتی محمود یا پروفیسر غفور کا بیان دراصل مارشل لاء حکام کی ترجمانی سمجھا جانے لگا ہے اور اب تو انہیں خیر سے بی ٹیم کا لائق فائق درجہ بھی مل گیا ہے چودھری ظہور الٰہی کے ایئر کنڈیشنڈ بنگلے کے لنچ اور ڈنر اور کنگ سائز انگلو آئس کریم کا ذائقہ رنگ دکھا رہا شاید مفتی محمود ذیابیطس کی وجہ سے میٹھی آئس کریم کے ذائقے سے محروم رہ جاتے ہوں جبھی وہ کبھی کبھی منہ کڑوا کرکے کہہ اٹھتے ہیں کہ الیکشن تو ہونا ہی چاہیئے مگر کب اور کیسے، اس بارے میں کچھ زیادہ اظہار خیال اس لئے نہیں کرتے کہ بہر حال ان کی زبان لنچ اور ڈنر کی مرغن غذاؤں سے لتھڑی تو رہتی ہے۔ ایسے میں کوئی سچ بات کہنا مرد حق ہی کا کام ہے

مولانا نورانی نے پاکستان قومی اتحاد کے منشور تنظیم کے عہدیداروں کے انتخابات کے طریقہ کار اور اصولوں کی خلاف ورزی کے الزامات عائد کرتے ہوئے پندرہ یوم کا جو الٹی میٹم دیا ہے اس پر مفتی محمود اور جماعت اسلامی کی جانب سے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا گیا ہے۔ حالانکہ نام نہاد سہی مگر اتحاد میں دوسری پارٹیاں بھی خیر سے سانس لے رہی ہیں جن کا کسی نہ کسی شکل میں ردِ عمل ظاہر ہونا چاہیئے تھا مگر ان کی خاموشی سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قومی اتحاد، جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے اسلام کے اتحاد تک سکڑ کر رہ گیا ہے۔ اور باقی پارٹیوں کی نمائندگی برائے نام رہ گئی ہے۔ مولانا نورانی کے الٹی میٹم پر جماعت اسلامی کے ردِ عمل کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جماعتی اخبار جسارت نے دوسرے دن اپنے اداریے میں مولانا کو توپ دم کر دیا۔ انہیں سارے فساد اور انتشار کی جڑ قرار دیتے ہوئے لکھا کہ "مولانا کے باہر جانے سے محاذ آرائی کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ مولانا حامد علی خان معاملات کو بحسن خوبی صلح کی جانب لے جا رہے تھے مگر مولانا نورانی کے افریقہ کے دورے سے واپسی کے بعد تصادم اور بیان بازی کا نیا سلسلہ جاری ہو گیا جس سے حالات بگڑ گئے۔" جسارت نے اپنے مخصوص مداری انداز میں اس کا سارا الزام مولانا نورانی کے سر دھر دیا اس دوران میری جماعت اسلامی کے چند رہنماؤں سے بھی ملاقات ہوئی جنہوں نے مولانا نورانی پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ مولانا نورانی کی پارٹی اتحاد چھوڑ چکی ہے اب اس کا اتحاد سے کوئی تعلق نہیں ہے، مگر وہ اصغر خان سے لائن لے کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں انہوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا نے مذاکراتی ٹیم سے تبادلہ خیال کے دوران اتحاد کے موجود عہدیداروں کو تسلیم کر لیا تھا اور آئندہ کے لئے عہدیداروں کے اتفاق رائے سے انتخاب کا اصول مان لیا تھا، مگر اصغر خان سے ملاقات کے بعد وہ اپنی بات سے پھر گئے ہیں اور اتحاد کے رہنماؤں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے۔ ہمیں اس بات کی مطلق پرواہ نہیں کہ جمعیت العلمائے پاکستان قومی اتحاد سے نکل جائے گی ہماری طرف سے کل جانے کی بجائے آج ہی چلی جائے۔"

جماعت اسلامی اور اس کے رہنماؤں کا یہ بڑا فطری ردِ عمل ہے۔ کیونکہ اتحاد پر جماعت کا عملاً کنٹرول ہے۔ مفتی محمود بھی اپنے روایتی سیاسی اخلاق و کردار کا چغہ اتار کر میاں طفیل محمد بن چکے ہیں سیاسی امور پر ان کے اور جماعت کے درمیان سیاسی اور فکری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً یہی کہ احتساب مکمل ہونے کے بعد انتخابات کرائے جائیں۔ دوم قومی مفاد کے پیش نظر قومی حکومت میں شرکت ضروری ہوئی تو کی جائے گی۔ پہلے بھٹو ازم کا خاتمہ کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح اب جماعت اور جمعیت میں کوئی واضح فرق رہا نہیں، علاوہ ازیں اتحاد کا جنرل سکرٹری جیسا اہم عہدہ بھی جماعت کے رہنما پروفیسر غفور کے پاس ہے۔ یہ بھلا کیونکر ممکن ہے کہ یہ لوگ کوئی اصولی بات تسلیم کرکے قومی اتحاد کے پلیٹ فارم کو تھال میں سجا کر مولانا نورانی کو پیش کر دیں گے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں یحییٰ خان کے دور میں مشرقی پاکستان کے ضمنی انتخاب کے بعد جماعت

اسلامی کو دوسری مرتبہ اقتدار میں شرکت کی سیڑھی ہاتھ لگی ہے۔ بھلا وہ اس موقع کو "اصولوں" کے چکر میں کیوں گنوانا چاہے گی۔ قومی اتحاد کا پلیٹ فارم جماعت کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ اس کی سیاسی پوزیشن صفر کے برابر رہ جائے۔ اور سیاسی سودے بازی کی حیثیت ختم ہو جائے۔

قومی اتحاد کے رہنما خود کو تحریک نظام مصطفےٰ اور بحالی جمہوریت کا چیمپئن قرار دیتے نہیں تھکتے۔ آج کے دنوں میں بھی جب کہ سبز باغ دکھانے کے دن مایوسی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا ہے۔ یہ رہنما اپنے ہر بیان اور تقریر کا آغاز نظام مصطفےٰ اور بحالی جمہوریت سے کرتے ہیں۔ مگر یہ سورما آج تک یہ نہیں بتا سکے کہ ان میں وہ کون لوگ ہیں جو ۱۸ اکتوبر کا الیکشن ملتوی کرانے کے لئے جنرل ضیا کے پاؤں پر گر گئے تھے مولانا نورانی نے قومی اتحاد کو جو الٹی میٹم دیا ہے، اس میں انہوں نے واشگاف الفاظ میں الزام لگایا ہے کہ بحالی جمہوریت کے دعویداروں کا عالم تو یہ رہا کہ ایک جانب تو وہ الیکشن کی بات کرتے ہیں اور دوسری جانب ۱۸ اکتوبر کے انتخابات ملتوی کرانے کے لئے جنرل ضیا کے پاؤں پکڑ لئے کہ اگر الیکشن ہوگا تو پیپلز پارٹی جیت جائے گی۔

یہ مسئلہ خاصہ اہم ہے اور کئی بار سامنے آچکا ہے کہ جنرل ضیا نے چند رہنماؤں کی مسلسل اپیلوں اور درخواستوں پر ۱۸ اکتوبر کا الیکشن ملتوی کیا۔ چونکہ وقت اور حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ الیکشن ہی ہمارے تمام مسائل کا حل ہے اور اگر وقت پر انتخابات ہو جاتے تو ملک کو موجودہ سنگین صورتحال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس لئے یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ جن رہنماؤں نے الیکشن کے التوا کا مشورہ دیا وہ ملک و قوم ہی کی نہیں بلکہ مسلح افواج کی شہرت، وقار اور ساکھ کو نقصان پہنچانے کے ناقابلِ معافی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لہٰذا ملک و قوم کے عظیم تر مفاد میں یہ بہتر ہوگا کہ جمہوریت اور انتخاب کے منحرف نام نہاد رہنماؤں کو قبل از وقت بے نقاب کیا جائے۔ تاکہ عوام دیکھ سکیں کہ انہیں آگ اور سمندر میں دھکیلنے والے رہنما ان کے مفادات سے غداری کر کے کسی طرح چور دروازے سے اقتدار کے ایوان میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔



انتخابات سے گریزاں اتحاد کے رہنماؤں کا اندازہ تھا کہ فوج کی آمد کے بعد سارے معاملات ان کے سہانے خواب کی طرح ٹھیک ٹھاک ہوں گے عوام میں پھیلی ہوئی مایوسی اور بے چینی ختم ہو جائے گی۔ اور وہ کچھ مدت گزرنے کے بعد فوج کی چھتری کے نیچے بننے والی "حکومت" میں وزارت کا قلمدان سنبھالنے کا اعزاز حاصل کر لیں گے۔ اس طرح عام انتخابات کی آزمائش سے گزرے بغیر انہیں اقتدار میں شرکت کا موقع آسانی سے مل جائے گا۔ مگر سوچا تھا کیا، کیا ہو گیا۔ ان کے خواب کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ عوام میں انتخابات کرانے کا مطالبہ زور پکڑتا گیا، اور اب عالم یہ ہے کہ رائے عامہ کے پریشر نے ولی خان، مفتی محمود،



مولانا طفیل محمد، چودھری ظہور الٰہی، پیر پگارا، پروفیسر غفور اور انہی کی قبیل کے دوسرے رہنما بھی جو انتخابات سے گریزاں اور دُور بھاگتے تھے۔ اب اپنی بچی کھچی ساکھ اور عزت بچانے کے لئے دبی دبی زبان سے انتخابات کا مطالبہ کرنے لگے ہیں حالانکہ قوم کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے کہ وہ انتخابات کے خلاف ان رہنماؤں کے بیانات کو فراموش کر دے۔ ان کا بس ایک ہی مطالبہ تھا کہ جب تک ملک کو بھٹو اثرات سے پاک نہ کر دیا جائے انتخابات کی ضرورت نہیں۔ بی بی سی نے ولی خان کی یہ بات تو آج تک فضا میں گونج رہی ہے کہ عبادت کے لئے زمین کو پہلے صاف ستھرا کرنا ہوگا ولی خان نے فرمایا تھا کہ انتخاب کی تاریخ کوئی آسمانی صحیفہ نہیں جسے تبدیل نہ کیا جا سکے اسی طرح مستی میں ڈوبے ہوتے جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد، پروفیسر غفور، مفتی محمود، پیر پگارا اور چودھری ظہور الٰہی پہلے احتساب پھر انتخاب کا نعرہ مستانہ لگایا کرتے تھے۔ اور پوری قوم ششدر تھی کہ یا الٰہی آخر انہیں کیا ہو گیا کہ تحریک تو جمہوریت کے نام پر چلا رہے تھے، مگر اقتدار آمریت کے لئے مضبوط کر رہے ہیں۔

اور اب جب انہیں پتہ چلا کہ عوام انتخاب اور صرف انتخاب اور جمہوریت چاہتے ہیں تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ انہیں مارشل لا کی ٹیم بننے کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ عالم یہ ہے کہ جماعت اسلامی جو ہمیشہ آمریت کے سائے میں ہاتھ پیر نکالنے کی کوشش کرتی ہے، اس کے امیر میاں طفیل محمد کو کراچی میں آمد کے موقع پر بریف کیا گیا کہ انتخابات کے موقف اور حکومت کی کاسہ لیسی کے سبب جماعت مکمل تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے کم از کم عوامی پلیٹ فارم سے انتخابات کی بات کی جائے۔ چنانچہ اس بریفنگ کے نتیجے میں میاں طفیل محمد نے، اندرون سندھ کے حالیہ دورے کے دوران بعض جگہوں پر دبی دبی زبان سے انتخابات کرانے کی بات کی ہے۔ مولانا کو تبرّ بازی سے بھلا کسے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ بھی انتخابات کی بات کر سکتے ہیں لیکن موصوف نے حال میں کراچی میں آمد کے موقع پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انتخابات کی کی تاریخ کا اعلان کیا جائے۔ بصورت دیگر عوام کو اعتماد میں لیا جائے۔"

اس بات کو تاریخ کا ارتقائی نقطہ نظر کہتے ہیں کل تک جو رہنما انتخابات کی بات کرتے ہوئے خوف و تذبذب میں مبتلا تھے، آج ٹھوس اور معروضی حقائق سے مجبور ہو کر انتخابات کے انعقاد کی بات کہنے پر مجبور ہو گئے۔ گو انہیں انتخابات اور جمہوریت میں اپنی سیاسی موت نظر آ رہی ہے۔ یہ حقیقت ہی ہے کہ جمہوری فضا میں جمہوریت دشمن قوتیں کیڑے مکوڑوں کی طرح مر جائیں گی۔



بھٹو کی سزائے موت جنرل ضیاء کے لئے مسائل پیدا کرے گی

دی مڈل ایسٹ - مئی ۱۹۷۸

پاکستان کے معزول وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت کا انحصار" اس بات پر ہے کہ اس کو کس زاویہ نگاہ سے پرکھا جاتا ہے۔ ۱۸ر مارچ کو لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے فوری بعد پاکستان کی مسلح افواج کا موقف یہ تھا کہ یہ کورٹ کا فیصلہ ہے اور اس پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا جا سکتا جبکہ اپیل زیر سماعت ہے لیکن پوری دنیا کا ردعمل اور خصوصاً مشرق وسطیٰ میں سیاسی تھا۔

اسلام آباد کے دفتر خارجہ میں پوری دنیا سے ٹیلیگراموں کا تانتا بندھ گیا۔ اور ان میں سب سے پہلے ترکی، کویت، متحدہ عرب امارات، جنوبی یمن، لیبیا اور پی ایل او خاص کر شامل تھے۔ پیغاموں کے مفہوم کو ظاہر نہیں کیا گیا لیکن ان میں ایک ذہین مدبر جناب بھٹو کے لیے گہری ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اور ..... فیصلے پر تنقید کی گئی اور اس ردعمل کی نشاندہی بھی کی گئی تھی جو کہ پورے علاقہ میں محسوس کی جاتی ہے۔

شہنشاہ ایران نے اس خدشہ کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا کہ اس سے علاقائی استحکام متاثر ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے پیغام کے مفہوم کا صحیح اندازہ لگانا زیادہ دشوار نہیں ہے۔ پاکستان کی فوجی حکومت کے سربراہ جنرل ضیاء الحق اپنے دورۂ ریاض کے دوران مشرق وسطیٰ کے دوسرے بڑے ملک سعودی عرب کے نقطہ نظر کو سننے کے لیے بھی متوقع تھے۔

معزول وزیر اعظم کی افو کھی سزائے موت پر پوری دنیا کا شدید ردعمل حیران کن تھا۔ جنرل ضیاء الحق کا بنیادی مقصد دراصل خود کو ایک بڑی سیاسی مخالفت سے پیچھا چھڑانا بھی تھا۔ لیکن سیاسی مخالفت کو ختم کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ نظر آتا ہے۔ بیگم نصرت بھٹو اور ان کی چوبیس سالہ صاحبزادی بے نظیر کی جدوجہد جاری ہے اور بھٹو کی موت ان کی زندگی سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

بھٹو کے خلاف کیس پیچیدہ تھا لیکن لاہور ہائیکورٹ نے قتل کا الزام ثابت کر دیا۔ ۱۹۷۴ء میں بھٹو کے سیاسی مخالف احمد رضا قصوری کی کار پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا قصوری فرار ہو گئے تھے لیکن ان کے والد جو ان کے برابر بیٹھے تھے سر پر شدید زخم آنے کے باعث ہلاک ہو گئے تھے قصوری نے الزام لگایا اس قتل کے پیچھے بھٹو کا ہاتھ تھا لیکن اس وقت پولیس کی تحقیقات کے دوران اس الزام کی کوئی واضح نشاندہی نہیں مل سکی۔ لیکن گزشتہ جولائی میں جنرل ضیاء کے اقتدار سنبھالنے کے بعد قصوری نے مطالبہ کیا کہ اس مقدمہ کی فائلیں دوبارہ کھولی جائیں۔ اور پھر بھٹو کی قسمت کو سیل کر دیا گیا۔

گزشتہ سال ستمبر میں جناب بھٹو اور ان کے ساتھ ایف ایس ایف کے چار دیگر افراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا جن میں سے تین نے اقدام قتل میں شریک ہونے کے الزام کو تسلیم کر لیا تھا۔ مقدمہ کی کارروائی کے دوران ایف ایس ایف کے سربراہ وعدہ معاف گواہ بن گئے۔ جنہوں نے اس قتل کا بندوبست کرایا تھا۔

بھٹو کا جرم، البتہ پاکستان کے مستقبل کو آسانی سے نہیں بنا سکتا۔ وہ اب بھی سندھ اور پنجاب کے دیہی علاقوں اور صنعتی شہروں کے محنت کش طبقے میں خاصے مقبول ہیں۔ اور جہاں انہیں طاقت کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور ان کے جرائم کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

ان کی سزائے موت کے خلاف پاکستان میں احتجاج بہت محدود تھا کیونکہ شہروں اور دیہاتوں میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد زیر حراست ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ضلعوں اور قصبوں میں پولیس کی بھاری جمعیت متعین کر دی گئی ہے۔ مظاہرین کو فوراً حراست میں لے لیا جاتا ہے۔ اور پھر انہیں ملٹری کورٹ میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں انہیں قید بامشقت اور کوڑوں کی سزا سنا دی جاتی ہے۔

بھٹو کو ختم کر کے جنرل ضیاء الحق اپنے تصوراتی پاکستان کے مستقبل کو واضح بنانا چاہتے ہیں۔ اب ایسا نظر آتا ہے کہ بھٹو کے مخالف سیاستدان نے قومی حکومت کے مسئلے پر رضامند کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں۔

انتخابات کے بارے میں جنرل ضیاء کا موقف یہ ہے کہ پاکستان فوری الیکشن کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ انہیں "مثبت نتائج" کی توقع نہیں ہو جائے گی۔ لیکن فوج اپنے اقتدار کو مایوسی کے ساتھ وسیع کرنا چاہتی ہے اور اس سلسلے میں سیاسی جماعتوں کے اتحاد کو بھی حکومت میں شامل کرنا چاہتی ہے تاکہ محاذ آرائی کی کشیدگی میں کمی پیدا ہو سکے اور دوسری جانب اہل سیاستدانوں کو بھی انتظامیہ چلانے کا تجربہ دیا جائے۔

البتہ الیکشن تا حال ناممکن ہیں کیونکہ جناب بھٹو اور ان کے خاندان کا کوئی بھی فرد یقیناً بھاری اکثریت سے الیکشن میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ صورتحال کب تک باقی رہے گی۔

فوجی جنتا بظاہر جناب بھٹو کی مقبولیت کو جلد از جلد ختم کرنے کے طریق کار کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ جنرل ضیاء کے پس پشت سخت مزاج مغز لوں میں سے ایک لیفٹیننٹ جنرل ایف اے چشتی نے بھٹو کے سیاہ کارناموں پر وائٹ پیپر جاری کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ان کے خیال میں جب لوگ اسے پڑھیں گے، وہ گھر جائیں گے اور اپنے دروازے بند کر کے آنسوؤں سے روئیں گے۔"

لیکن بھٹو کے سیاہ کارناموں کی داستانیں سرکاری پریس میں گذشتہ نو ماہ سے چھپ رہی ہیں لیکن ان کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

اگر فوجی جنتا ان سے اپنا فوری اور موثر طریقے سے پیچھا چھڑا بھی لے اور اگر ایک لنگڑی لولی سیاسی حکومت

فوج کے ساتھ برسراقتدار آجائے تو بھی مسائل بدستور باقی رہیں گے ــــ اقتصادی طور پر پاکستان اب تک کمزور ہے۔ خزانہ کے سیکرٹری آفتاب احمد خاں نے مارچ میں کہا تھا کہ "جب تک پاکستان دولتمند ملکوں سے اپنے قرضوں کی ادائیگی میں ترمیم نہیں کرالیتا ملک کو اقتصادی طور پر غیر معمولی صورتحال کا سامنا کرنا ہوگا۔ قرضوں پر سود کی مجموعی ادائیگی جو سات ملین ڈالر تھی اب پانچسو ملین ڈالر سالانہ تک پہنچ چکی ہے۔ جبکہ پاکستان کی مجموعی برآمدات کی ایک تہائی کے مساوی ہے۔

آئندہ چند ماہ پاکستان کی قسمت کے لیے آزمائش کے دن ہوں گے۔ لیکن داخلی معاملات میں جنرل ضیاالحق کی ناکامی ملک اور علاقہ کے لیے یقیناً نازک ترین ہیں۔



مُرتضیٰ بھٹو کا ویڈیو انٹرویو

بھٹو کی موت سے ملک کے مصائب میں اضافہ ہو جائے گا

مذہبی معاملات میں بھی ملکی آئین افضل ہوتا ہے

پاکستان کے سابق وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کینیڈا کی دعوت پر ۱۴ مئی ۱۹۷۸ء کو ٹورنٹو پہنچے سٹی ہال کے باہر کھلے میدان میں انہوں نے پاکستانیوں سے خطاب کیا۔ اسی دورے کے دوران مسٹر رابندر ناتھ نے اُن سے انٹرویو لیا۔ جو ریڈیو ٹورنٹو سے نشر ہوا۔ ہم یہ انٹرویو روزنامہ نوائے وقت لاہور کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں ــــ (ادارہ)

گوہر ایوب ہر وقت تقریر کرنے کے موڈ میں رہتا تھا

س: مسٹر بھٹو کے خلاف ہائی کورٹ کے فیصلے میں کیا خامیاں ہیں اور کیا بے انصافیاں ہیں؟

ج: سب سے بڑی بے انصافی تو یہ ہے کہ جب گذشتہ سال ستمبر میں میرے والد کو ضمانت پر جن جج صاحبان نے رہا کر دیا تھا ان سب ججوں کو نکال دیا گیا نئے ججوں کو متعین کرنے سے پہلے کہا گیا کہ تم مارشل لا کے ساتھ وفاداری کی قسم لو۔

س: پاکستان کی موجودہ ہائی کورٹ کے ججوں کو بھٹو صاحب نے تعینات کیا تھا یا وہ پہلے سے ہائی کورٹ میں نہیں تھے یا کہ وہ نئے جج ہیں۔

ج: مولوی مشتاق تو ایوب خان کے زمانے سے چلے آرہے ہیں۔ ہم نے انہیں تعینات نہیں کیا تھا لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں عدالتوں میں انصاف ہوتا تھا پریس آزاد تھا۔

س: ان دنوں کہا جا رہا ہے کہ پاکستان میں شرعی نظام قائم کیا جائے گا۔ کیا بھٹو کو سزا دینے والی عدالت شرعی احکام کے مطابق بنی ہے۔

ج: پتہ نہیں کون سے قانون سے بھٹو صاحب کو سزا ملی ہے موجودہ حکمران کہتے ہیں کہ آئین اور قانون ہے اگر آئین اور قانون ہے تو بھٹو صاحب پرائم منسٹر ہونے چاہئیں۔

س: مارشل لا کا آئین کیا صحیح نہیں؟

ج: مارشل لا کا تو آئین ہی نہیں ہوتا۔

س: کون سے لوگ ہیں جنہیں بھٹو صاحب کی موت سے سیاسی فائدہ ہوگا۔

ج: کسی کو ان کی موت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں فائدہ ہوگا وہ غلطی پر ہیں جس دن انہیں قتل کیا جائے گا۔ اس دن سے ان کے مصائب میں اضافہ ہوگا۔

س: بھٹو کو چھوڑ دینے کی مہم پاکستان میں کتنی تیز ہے؟

ج: سب لوگ جیلوں میں بند پڑے ہیں کسی بھی مہم کے متعلق مجھے کوئی خبر نہیں۔

س: پاکستان سے آپ کب باہر آئے ہیں؟

ج: میں گذشتہ سال ستمبر میں پاکستان سے نکلا ہوں۔

س: کیا حکومت نے آپ کو باہر جانے سے نہیں روکا؟

ج: میں نے ویزا نہیں لیا تھا، صرف برٹش ایرویز کا ٹکٹ خریدا اور جہاز میں سوار ہو کر لندن آگیا۔

س: کسٹم یا امیگریشن میں کسی نے آپ کو نہیں روکا۔

ج: ہاں جونیئر آفیسر ہوں گے۔ انہیں خیال نہیں آیا یا وہ پہچانتے نہ ہوں گے۔

س: آپ نے ابھی آزادیٔ صحافت کا ذکر کیا ہے بھٹو صاحب کے دور میں آپ کے کہنے کے مطابق پریس آزاد تھا۔ مگر ولی خاں، غفار خاں اور گوہر ایوب کو تو آزادیٔ اظہار کی اجازت نہیں دی گئی۔ غفار خاں اور ولی خاں کو تو ساری عمر قید میں بند رکھا گیا۔

ج: ۲½ سال نیپ کی حکومت رہی ہے جو قتل و غارت کرواتے تھے۔ بموں کے دھماکے کرواتے تھے۔

س: اور گوہر ایوب؟

ج: گوہر ایوب کی جب مرضی ہوتی تھی وہ تقریر کرنے بیٹھ جاتا تھا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک کو کھلی چھٹی دے دی جائے۔

س: جمہوریت میں اگر انسان کو تقریر کا حق نہیں تو جمہوریت کس بات کی۔

ج: آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سے ممالک میں بعض لوگوں کو تقریر کی آزادی نہیں۔ امریکہ، جرمنی اور انگلینڈ میں بعض لوگوں پر پابندیاں ہیں۔ آپ نے ۱۹۶۸ء میں بلیک پاور تحریک کا قصہ سنا ہوگا۔ حال ہی میں پیٹی ہرسٹ کی خبریں آپ نے پڑھی ہوں گی۔

س: کیا آپ گوہر ایوب اور ولی خاں کا مقابلہ بلیک پاور وغیرہ سے کر رہے ہیں۔

ج: جی ہاں۔

س: پچھلی ہال ٹورنیٹو میں آپ نے حقوق انسانی کا ذکر کیا تھا۔ کیا اس کا مرزائیوں پر اطلاق نہیں ہوتا۔

ج: جی ہاں ان پر بھی ان کا اطلاق ہوتا ہے مگر ہم نے انہیں جیل میں تو نہیں ڈالا تھا۔ وہ قرآن کی رُو سے صحیح مسلمان نہیں ہیں۔

س: قرآن اور شریعت کا ترجمہ کیا علماء کریں گے یا کہ آئین کرے گا۔

ج: علماء آئین کے جزو ہیں۔

س: کیا کسی بھی آئین بنانے والی کمیٹی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان لوگوں (مرزائیوں) کو جو اتنے برس سے مسلمان چلے آ رہے ہیں ایک قلم کی جنبش سے اقلیت یا غیر مسلم قرار دے دے۔

ج: آئین ہر ملک میں افضل ہوتا ہے۔

س: کیا مذہبی معاملات میں بھی۔

ج: جی ہاں۔

س: تو کل کوئی سُنّی سرکار آتی ہے اور وہ شیعوں کو اقلیت قرار دے دیتی ہے تو کیا یہ صحیح ہوگا۔

ج: آئین یا دستور یہ کہتا ہے کہ جو عالمی اسلامی قوانین ہیں وہ لاگو کرو۔ مرزائی سعودی عرب اور دوسرے کئی ممالک میں غیر مسلم سمجھے جاتے ہیں۔

س: مرزائی ہندوستان میں تو غیر مسلم نہیں ہیں جناب یہ جھگڑا وہاں تو بالکل نہیں ہے جو پاکستان میں ہے۔

ج: ہندوستان مسلم ملک نہیں ہے۔

س: ہندوستان میں مسلمان نہیں ہیں کیا وہاں پر مسلمانوں کو الگ تو نہ کریں۔

ج: ہم نے یہ جھگڑا نہیں چھیڑا تھا۔ یہ تو حزب مخالف نے شروع کیا تھا۔

س: میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ ایک دستور ساز کمیٹی مذہبی معاملات میں کسی ایک کمیونٹی کو غیر مسلم قرار دینے کا کیا حق رکھتی ہے کیا پاکستان میں کوئی علماء کا بورڈ بیٹھا تھا ان میں بحث ہوئی تھی کیا کہ مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا جائے۔

ج: یہ حقوق انسانی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔

س: اگر آج ہندوستان والے یہ کہہ دیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے سلسلہ میں جو مشکلات ہیں وہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ج: جی ہاں۔ یہ ہے ہی فرقہ وارانہ مسئلہ۔

س: نہیں جناب ایسا نہ کہیئے۔ پاکستان کی گذشتہ حکومتوں نے دنیا میں مسلمانوں کی مشکلات کے بارے میں جتنے بھی بیانات دیتے ہیں۔ ان میں انہوں نے غیر ممالک میں مسلمانوں کی سمیساؤں کو (فرقہ وارانہ) نہیں مانا وہ تو اسے (حقوق انسانی) کا مسئلہ کہتے رہے ہیں۔

ج: جب دو مذہبی فرقوں میں مشکل پیش آئے، تو اسے کہتے ہی فرقہ وارانہ مسئلہ ہیں۔

س: آخر میں یہ بتلایئے۔ کہ اس وقت پاکستان میں کوئی امید ہے یا کہ لوہے کا شکنجہ سارے ملک میں جکڑ دیا گیا ہے اور باہر سے کوئی حملہ آور ہو اور بھٹو کو رہا کروا دے مگر ملک کی دیواروں کو چیر کر یہ آواز باہر نہیں پہنچے گی۔

ج: پورے ملک کے باشندوں کو زنجیریں پہنا کر ریس کورس گراؤنڈز اور خالی عمارتوں میں بند کر دیا گیا ہے اور اندر سے حملہ کرنے میں وقت لگے گا۔

(بشکریہ نوائے وقت لاہور ۶ جون ۱۹۷۸ء)



بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ

نیوز ڈیک ۱۲ جون ۱۹۷۸ء

بھٹو کی موت کے بارے میں فیصلہ

برصغیر کے معاملات سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ حیثیت کے حامل ذرائع یہ بات پھیلا رہے ہیں کہ پاکستان کی فوجی حکومت نے خفیہ طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ سپریم کورٹ میں معزول وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل پر کارروائی مکمل ہونے کے بعد انہیں پھانسی چڑھائیں گے۔ اگر فیصلہ برقرار رہتا ہے تو بھٹو کو اگلے دو تین ماہ میں پھانسی دے دی جائے گی۔ بھٹو کو جن کا ۱۹۷۷ء کی بغاوت میں تختہ الٹا گیا تھا۔ پچھلے مارچ میں۔ ۱۹۷۴ء میں ایک سیاسی حریف کے خلاف مشین گن سے حملہ منظم کرنے کا مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ سپریم کورٹ سزائے موت برقرار رکھے گا۔ لیکن فیصلے کے خلاف بھٹو کے حامی پاکستانیوں میں اور ایران اور سعودی عرب جیسے طاقتور ہمسایوں میں بڑھتے ہوئے احتجاج کی وجہ سے جنرل ضیاء الحق کی حکومت فیصلے پر واقعتاً عملدرآمد کرنے میں ہچکچا رہی ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ ضیاء اور ان کے مشیروں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بھٹو کی موت پر شروع ہونے والی کوئی شورش چند ماہ بعد دب جائے گی۔ لیکن جب تک سابق وزیر اعظم زندہ ہیں وہ فوجی حکومت کے مخالفین کے لیے نکتہ اتحاد بنے رہیں گے۔

آئندہ حکومت کیسی ہوگی نت نئے شوشوں پر اکتفا کیجئے

سیاست کے "تان سین" اکبر بادشاہ کی پسند کے راگ چھیڑ رہے ہیں

معلوم ہوا ہے کہ آجکل حکومت "رائے فارمولا" پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے واضح رہے کہ کچھ عرصہ قبل پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ مسٹر محمد حنیف رامے نے حکومت کو تجویز دی تھی کہ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا کر غیر جماعتی نظام اور غیر جماعتی اسمبلی منتخب کی جائے رامے صاحب نے یہ تجویز اس وقت دی تھی جب بقول خود مسلم لیگ کے مردے میں جان ڈالنے میں ناکام ہونے کے بعد مسلم لیگ سے الگ ہو کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ قائم کرنے کی دوڑ دھوپ شروع کی۔ یہ دوڑ دھوپ ہنوز جاری ہے اُدھر حکومت نے ان کی تجویز پر غور شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے کچھ حکومتی اخبارات میں بڑی سرخیوں کے ساتھ خبریں شائع ہوئیں۔ جن کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ ان خبروں کے ذریعے حکومت عوام اور مختلف سیاسی جماعتوں کا ردّعمل معلوم کرنا چاہتی ہے۔ توقع یہ تھی کہ حسب معمول پی این اے کے رہنما اس تجویز کی حمایت کرینگے اور تحریک استقلال کے قائد مسٹر اصغر خان اس تجویز کی سختی سے مخالفت کرینگے۔ مگر اس کے برعکس مسٹر اصغر خان نے اول تو خود سے اس تجویز کے بارے میں کوئی ردِّ عمل ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر جب ایک شام کے اخبار کے رپورٹر نے ان سے سیاسی پارٹیوں پر عائد کی جانے والی متوقع پابندی کے بارے میں ان کا ردِّعمل معلوم کرنے کی کوشش کی تو ریٹائرڈ ایئر مارشل پوری بات کو گول کر گئے اور کوئی موقف ظاہر کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف معمول کے برعکس مفتی محمود حتیٰ کہ جماعتِ اسلامی کے میاں طفیل اور پروفیسر غفور احمد کھل کر اس تجویز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اور ملک میں سیاسی پارٹیوں پر پابندی کو ملک کے مفادات کے منافی قرار دے رہے ہیں کچھ حضرات نے تو اس صورتحال پر دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ۵ جولائی کے بعد پہلی بار جماعتیے اور مفتی محمود نے اصغر خان کے مقابلے میں پوائنٹس بنائے ہیں۔ باخبر سیاسی مبصران دونوں سیاسی گروپوں کے موقف کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی رائے کے مطابق دونوں گروپ کسی نہ کسی کے اشاروں پر ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

بہر حال ایسے وقت جب کسی بھی وقت سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد ہونے کے امکانات موجود ہوں ایسے وقت طفیل محمد اور غفور احمد جیسے سیاستدانوں کے اس قسم کے مخالفانہ بیانات قابلِ غور ہیں۔ جدید لغت میں اس قسم کے سیاسی رہنماؤں کو سیاست کے تان سین کہا جاتا ہے جو صرف راگ چھیڑنے کے عادی ہیں جو وقت کے



"اکبر بادشاہ" کی پسند ہوں۔ مگر اب جوان صاحبوں نے اچانک "دربار" سے بھیروی راگ شروع کر دیا ہے اس پر سب لوگوں کو حیرت ہے۔ اب تو چودھری ظہور الہٰی بھی آغا شاہی پر تنقید کر رہے ہیں جبکہ دوسری طرف پیر صاحب پگارا نے بھی میاں طفیل محمد کی طرز کا ایک عدد بیان جاری کر دیا ہے۔ یہ بیان ڈرافٹ کون کر رہا ہے اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے باوجود ان کی وسیع اشاعت کا کون ذمہ دار ہے۔؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو ہر ایک کے ذہن میں گونج رہے ہیں کیا کوئی اہم تبدیلی آنے والی ہے جس کا ان کو قبل از وقت علم ہو گیا ہے یا حکومت واقعی الیکشن کے سلسلے میں کوئی مشتبہ قسم کا اعلان کرنے والی ہے جو ان حضرات سے اس قسم کے بیانات دلوا کر ان کو کریڈیٹ دلوانے کی کوشش کی جا رہی ہے یا پھر پہلی بار ان حضرات نے عوام کا دباؤ محسوس کیا ہے اور اس دباؤ سے مجبور ہو کر یہ لوگ اس قسم کے بیانات دینے پر مجبور ہو گئے ہیں یا یہ سب کچھ کسی اہم رسّہ کشی کا نتیجہ ہے؟

اس کے اسباب کچھ بھی ہوں مگر ۸ اور ۹ جون کی درمیانی رات کو افواہ کافی گرم تھی کہ آج رات ۱۰ بجے کے قریب سیاسی جماعتوں پر پابندیوں کے سلسلہ میں آرڈی ننس آ رہا ہے۔ لوگ ساری رات انتظار کرتے رہے مگر کوئی ایسا آرڈی ننس جاری نہیں ہوا۔ بہرحال امکان اب بھی موجود ہے اور کسی وقت بھی اس قسم کا حکم صادر ہو سکتا ہے۔ سنا ہے کہ کچھ بیرونی اسٹیشنوں نے بھی اس قسم کی خبر نشر کی ہے کہ آئندہ کچھ دنوں کے اندر پاکستان میں سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی جائے گی۔

آج کل ملکی سیاسی سطح پر کافی باتیں غیر متوقع ہو رہی ہیں۔ مثال کے طور پر پہلی بار پی پی کے مسٹر جتوئی مخدوم حامد رضا گیلانی اور صاحبزادہ فاروق علی خان نے کھل کر مولانا کوثر نیازی پر تنقید کی تھی، ہز ماسٹرز وائس قرار دیا۔ اور کہا کہ انہیں پارٹی سے نکالا جا چکا ہے ادھر مولانا نے بھی ہلکے انداز میں جتوئی پر نکتہ چینی کی، پتہ نہیں یہ جتوئی اور حامد رضا گیلانی کے نئے موقف کا نتیجہ ہے۔ جو مولانا آجکل ساری گرمی، زمینداروں، اور جاگیرداروں پر نکال رہے ہیں اس قسم کا تبصرہ انہوں نے دو دن پہلے یہاں ایک صنعتکار طارق سعید کے دفتر میں تقریر کرتے ہوئے کیا۔ مولانا کچھ دنوں سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ یہاں اخباری نمائندوں سے بھی ایک عدد ملاقات کی۔ جس کے لئے سوچ سمجھ کر اخبار والوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

شہنشاہ کو سب سے بڑا خطرہ سیاہ پوش شیعہ علمائے سے

ایران میں آئینی حقوق

اور آزادانہ انتخابات کا مطالبہ



شریعت مدار ←



وقائع نویس

تیل کی دولت سے مالا مال ایرانی اپنے گھر میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں اور درآمدی سامان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا ایران مزید سیاسی اور جمہوری آزادی کا متحمل ہو سکتا ہے اگر یہ حقوق عوام کو حاصل ہو جائیں تو ایران میں شہنشاہیت کے کتنے دن باقی رہ جائیں گے؟

مغربی مبصرین کا کہنا ہے کہ شاہ ایران محمد رضا پہلوی کے ۲۵ سالہ دور نے ایران کی جاگیردارانہ قوم کو بتدریج ایک ماڈرن سوسائٹی میں تبدیل کر دیا۔ شاہ ایران نے ۱۹۷۶ء میں اس بات کو محسوس کیا کہ قوم کو زیادہ دیر ڈنڈے سے ہانکنا مشکل ہوگا۔ چنانچہ سیاسی میدان میں لبرل رویے کی جانب توجہ دی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ شاہ کی حکومت کا اہم ستون، خفیہ پولیس کی تنظیم شاواک کے ایجنٹ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ان کے تشدد کے طریقۂ کار گستاپو سے ملتے جلتے ہیں۔ شاہ کے معتدل رویے کے پیش نظر شاواک کی چیرہ دستیوں کو کسی حد تک کنٹرول کیا گیا۔ اخبارات پر سخت سنسر شپ میں نرمی کی گئی، دانشوروں اور طلباء کو محدود نکتہ چینی کی اجازت بھی دی گئی۔ جس کے نتیجے میں ایران میں گذشتہ پندرہ سال سے جو شدید گھٹن، بے چینی اور بیزاری کا لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا، یکدم پھٹ پڑا۔ پچھلے دنوں مختلف شہروں میں ہنگاموں کے دوران کم و بیش چالیس افراد ہلاک ہو چکے ہیں، مرنے والوں میں طلباء اور مزدور ل

کی اکثریت ہے۔

سب سے زیادہ بے چینی طلبا میں پائی جاتی ہے' وقتاً فوقتاً ان کی صفوں سے احتجاج کی لہریں اٹھتی رہی ہیں۔ حکومت اس کی ذمہ داری ایک ایسے گروپ پر ڈالتی ہے جس کو ایران میں اسلامی مارکسسٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ گروپ شاہِ ایران کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ کی حکومت کو ایک دوسرے سیاسی گروپ یونیٹی آف نیشنل فرنٹ فورسز کے چیلنج کا بھی سامنا ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ پارٹی دراصل بائیں بازو کے سابق وزیر اعظم محمد مصدق کی پارٹی نیشنل فرنٹ کی نئی شکل ہے۔

شاہ کی حکومت کو مغربی مبصرین کے مطابق سب سے بڑا خطرہ سیاہ پوش شیعہ علما سے ہے، جن کی قیادت آیت اللہ شریعت مدار کر رہے ہیں، ان کی عمر ۸۱ سال ہے' اور وہ عوام میں بڑی قدر و منزلت اور حد درجہ احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ شاہ ایران اور شیعہ علما کے درمیان اختلاف کی بنیاد ۱۹۶۲ء میں اس وقت پڑی جب شاہ نے سفید انقلاب کی کامرانی کے لئے وقف شدہ دینی املاک کو ضبط کرنے کا اعلان کیا۔ اور اس اقدام کو زرعی اصلاحات کا اہم حصہ قرار دیا۔ بنا بریں شریعت مدار نے شہری حقوق کی بحالی' پرانے دستور کی دفعات کی بحالی اور نگران کمیٹی میں پانچ علما کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا جو اس بات پر کڑی نگاہ رکھیں کہ شریعت کے منافی کوئی قانون منظور نہ ہو سکے۔

ایران میں حالیہ ہنگامے اس وقت عروج پر پہنچے جب تہران سے ۵۰ میل جنوب میں علما کے شہر قم میں ایک مظاہرے کے دوران پولیس فائرنگ سے نو افراد ہلاک ہو گئے۔ قم تین لاکھ افراد پر مشتمل ایک مذہبی اور روایتی شہر ہے۔ اور جہاں علما کا زبردست اثر ہے۔ اس اندوہناک واقعہ پر چالیس روز تک سوگ منایا گیا۔ اس دوران مظاہرین پھر ایک بار سڑکوں پر نکل آئے۔ پولیس نے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں متعدد افراد ہلاک و زخمی ہوتے۔ ۱۰ مئی کو جب حضرت فاطمہؓ کا یوم وفات منایا جا رہا تھا تو چھاتہ بردار فوج، قم میں شریعت مدار کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو گئی۔ فوج کی فائرنگ سے دینی مدرسے کا ایک طالب علم ہلاک ہو گیا۔ اس خبر سے قم کے علاوہ ایران کے دیگر شہروں میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔

اس حادثے کی وجہ سے شیعہ فرقے کے جذبات بھڑک اٹھے۔ قم کے اپنے مکان میں آئت اللہ شریعت مدار نے ٹائم کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔ کہ "عوام کی نگاہوں میں یہ حادثہ، ایران میں انقلاب لانے کے لئے کافی تھا۔ اس ضمن میں حکام نے میرے پاس آنے والے خطوط اور ٹیلی گراموں کو روک دیا۔ مگر اب بھی شہریوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ اور وہ مجھ سے انقلاب برپا کرنے کی اجازت مانگتے ہیں۔ لیکن میں نے انہیں پر امن رہنے کا مشورہ دیا لیکن شیعہ رہنما پر حملہ کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔" انہوں نے کہا کہ موجودہ ہنگاموں اور بے چینی کی متعدد وجوہ ہیں۔ جن میں غیر قانونی اقدامات، تشدّد، ٹارچر کے نت نئے طریقے، تحریر و تقریر پر پابندیاں، سول ملازمین کا ناروا سلوک اور رشوت ستانی کا بڑھتا ہوا رجحان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔" انہوں نے مطالبہ کیا کہ عوام کو مکمل آئینی حقوق دیئے جائیں۔ اور آزادانہ انتخابات کرائے جائیں۔"

ایران کے حالیہ واقعات پر بعض سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ شاہ کے خلاف ایران کے علما اور بائیں بازو کے انقلابی متحد ہیں۔ دراصل یہ بائیں بازو کی حکمت عملی کی کامیابی ہے کہ اس نے سیاہ پوش عاموں کو انقلاب سے قریب کر لیا ہے۔ دونوں کا کاز ایک ہے کہ ایران کو بادشاہت کے دور سے نکال کر جمہوریت' انصاف اور مساوات کے راستے پر ڈال دیا جائے۔ بعض سیاسی مبصرین علما کے کردار پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "قدامت پرست ملاّ" مذہب کی آڑ میں شاہ کی اصلاحات اور جدید ترقیات کو ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاہ کے اقتدار کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا کہ سارے وسائل اور ریاستی مشینری پر شاہ کا ابھی مضبوط کنٹرول ہے۔ کاشت کاروں اور فوج پر بھی ان کا اثر ہے۔ ساتھ ہی تیل کے وسائل سے جو صنعتیں جنم لے رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایک خوشحال متوسط طبقہ بھی وجود میں آیا ہے۔ جس کے مفادات شاہ سے وابستہ ہیں۔

جہاں تک شاہ ایران کا تعلق ہے تو یہ سوچنا خام خیالی ہے کہ وہ عوام کو مکمل جمہوری، سیاسی اور شہری حقوق دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔ البتہ ایران کی ملیٹری کے خطرے کو لبرل اقدامات سے بچانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ گذشتہ اگست میں مصارف زندگی میں اضافہ کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ حکومت نے توانائی کے استعمال میں جو کمی کی تھی اس کے نتیجے میں صنعتوں کو کروڑوں ڈالر کے نقصانات ہوتے تھے۔ افراطِ زر کا مسئلہ بھی سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ اگست میں افراطِ زر کی شرح ۳۲ فیصد سے زیادہ ہو گئی تھی۔ متعدد ترقیاتی اور ہاؤسنگ اسکیموں کو روکنا پڑا تھا۔

ایران کے وزیر اعظم آموز گار نے دعویٰ کیا ہے کہ تخریب کار عناصر مذہبی تنظیموں کو استعمال کر رہے ہیں۔ حکومت ان لوگوں کے خلاف سخت قدم اٹھائے گی جو آزادی کے مفہوم کا استعمال غلط کرتے ہیں۔ آموز گار نے یہ بھی کہا کہ حکومت "ملاؤں" کے دل جیتنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پہلے قدم کے طور پر فحش فلموں پر پابندی عائد کر رہی ہے۔"

مغربی دنیا بالخصوص امریکہ کو ایران کے استحکام سے گہری دلچسپی ہے کیونکہ ایران امریکہ کا اتحادی اور اسلحہ کا سب سے بڑا خریدار ہے۔ نیز ایران کے تیل سے امریکی صنعتوں کے ایک حصّے کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔ تاہم یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایران کے تیل کے ذخائر بتدریج ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید اس کے بعد مغربی دنیا کی ایران سے اس قدر دلچسپی نہ رہے۔ ایران کے ایک جانب سوویت یونین، مغرب میں عراق کی بائیں بازو کی حکومت اور مشرق میں افغانستان کی بائیں بازو کی نئی حکومت کی سرحدیں ملتی ہیں۔ خلیج فارس کے علاقے میں ایران مغرب کا قریبی اور فوجی ساز و سامان کے اعتبار سے طاقتور اتحادی ہے۔ گذشتہ سال ایران کے تیل کی برآمدات میں ۳ فیصد کمی کے باوجود اس کی آمدنی سالانہ ۲۲ بلین ڈالر رہے، شاہ ایران کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تیل کے ختم ہونے والے ذخائر کی آمدنی ایسی مدّات پر خرچ کی جائے جس سے عوام کی قوتِ خرید میں اضافہ ہو اور ان میں موجود بے چینی ختم ہو سکے۔ مگر یہ مسئلہ خاصہ گمبھیر دکھائی دیتا ہے کیونکہ تیل کی آمدنی سے ایران کے مخصوص اور بالا دست طبقات کے سوا عوام کی اکثریت کو فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے' یہی وجہ ہے کہ ایران کے عوام ایک نئے آزاد اور جمہوری نظام میں اپنی سلامتی، خوشحالی اور استحکام کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور شاہ اس کوشش میں ہیں کہ اپنی لبرل پالیسیوں کے ذریعے اس جوالا مکھی کو پھٹنے سے پہلے ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ دیکھئے ایران کے مستقبل کی تاریخ اس سوال کا کیا جواب دیتی ہے۔

مساوی حقوق

امر جلیل

میرے ایک ناقد کا ارشاد ہے کہ میں ملک کی پچاسی فی صد آبادی کے مسائل کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ خاموش رہتا ہوں۔ یعنی خواتین کے حقوق وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا۔ اور یہ کہ آج کل خواتین مساوی حقوق کے لئے جو بے مثال جدوجہد کر رہی ہیں اس کے بارے میں کچھ کہنے اور لکھنے سے گریز کرتا ہوں۔ ان کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ میں خواتین کی حمایت نہیں کرتا۔ اور اپنی تحریروں میں مرد کی برتری کا ڈھول پیٹتا رہتا ہوں۔ مجھے اعتراض ڈھول پیٹنے پر نہیں ہے۔ ڈھول پیٹنا ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ ہم ڈھول پیٹنے کو معیوب نہیں سمجھتے۔ ہم ڈھول اس لئے پیٹتے ہیں کہ ڈھول اندر سے خالی ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ ڈھول کی آواز دور تک سنائی دیتی ہے اور جب ڈھول کی آواز دور سے سنائی دیتی ہے۔ تب دور کے ڈھول سہانے محسوس ہوتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو اندر سے خالی ہوتی ہے زیادہ شور کرتی ہے۔ زیادہ شور شرابے سے آپ دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکتے ہیں۔ اور تکمیل حاصل کر سکتے ہیں۔

میں منافق نہیں ہوں۔ اس لئے مرد کی برتری کا منکر نہیں ہو سکتا۔ مرد افضل ہے۔ بلکہ فضل محمود ہے۔ اوول کا ہیرو ہے اور ایک ٹیسٹ میچ میں بارہ وکٹ لے سکتا ہے۔ میں خواتین کی بے مثال جدوجہد کی حمایت نہیں کر سکتا۔ مرد کے مقابلے میں عورت کمتر ہے۔ کمزور ہے۔ وہ دل تو لوٹ سکتی ہے لیکن بنک نہیں لوٹ سکتی۔ وہ ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔ وہ گھونسہ نہیں مار سکتی۔ وہ گالی نہیں دے سکتی۔ ان اوصاف کی عدم موجودگی میں' میں کیونکر خواتین کی حمایت کر سکتا ہوں۔ اس سے بحث نہیں کہ ماں کے پیروں تلے جنّت ہوتی ہے۔ ہماری ماں مر گئی ہے۔ ہمیں سوتیلی ماں نے پالا ہے۔ سوتیلی ماں کے پیروں تلے جنّت نہیں ہوتی۔ سوتیلی ماں کے پیروں تلے چپّل ہوتی ہے جس سے وہ بے دریغ پٹائی کرتی ہے۔

ایک ترقی پذیر معاشرے میں عورتیں منہ میں پائپ لگا کر بیوروکریٹ نہیں بن سکتیں۔ عورتیں کمپلیٹ سوٹ پہن کر اور ٹائی لگا کر انگریز مائی باپ کی یاد تازہ نہیں کر سکتیں۔ عورتیں معاہدوں پر دستخط نہیں کر سکتیں اور معاہدوں پر دستخط کے بعد مسکرا کر تصویر نہیں کھنچوا سکتیں۔ وہ وفد کی صورت میں بیرونِ ملک نہیں جا سکتیں۔ وہ کسی وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ سے ملاقات نہیں کر سکتیں۔ وہ صرف ٹالپس اور نیکلس خرید سکتی ہیں۔ ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت میں ایک خاتون اپنے باس کے لئے تقریر لکھ تو سکتی ہے لیکن تقریر کر نہیں سکتی۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ قلوپطرہ تقریر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی بروٹس سے قلمی دوستی تھی۔ بروٹس کبھی نہیں مرتا۔ وہ تاریخ کے ہر دور میں سیزر کے خنجر گھونپ دیتا ہے۔ بروٹس عام طور پر موٹے ہوتے ہیں اور ان کی توند نکلی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک عورت ماتا ہری تو بن سکتی ہے لیکن بروٹس نہیں بن سکتی۔ عورت کی کمزوری کے پیشِ نظر انگریز مائی باپ نے چیئرمین کی اصطلاح کو فروغ دیا اور چیئروومن کی اصطلاح کو لغت سے خارج کر دیا۔ لہٰذا جب کوئی عورت چیئرمین بننے کی کوشش کرتی ہے تو اسے چیئروومن بنا دیا جاتا ہے۔

میں دنیا کے معاشروں کا حوالہ نہیں دیتا۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ میں اپنے معاشرے کے حوالے سے خواتین کی اہمیّت کا تجزیہ کروں گا۔ ایک صاحب عالم ہیں۔ فاضل ہیں۔ وہ بات بات میں دنیا کے بڑے بڑے عالموں ادیبوں سیاستدانوں اور مفکّروں کے افکار سے حوالے دیتے ہیں۔ انقلاب کے بارے میں کامیو نے یہ کہا۔ چے گیوارا نے یہ فرمایا۔ اقتصادی استحصال کے سلسلے میں مارکس نے یوں کہا۔ اور اینگلس نے یوں کہا۔ ایک روز کسی نے ان سے کہا۔ حضرت یہ تو درست ہے کہ کامیو نے یوں کہا اور چےگوارا نے دوں کہا اور مارکس، اینگلس اور سارتر نے دوں کہا لیکن آپ بھی تو کچھ کہیں۔ آپ بھی کچھ فرمائیں۔ آخر لنڈے پر کب تک انحصار کریں گے۔ بہت خفا ہوئے خیر وہ ایک مرد تھے۔ ہم ذکر کر رہے ہیں خواتین کا۔

ہمارے معاشرے میں ۹۹ فیصد کام ایسے ہیں جو صرف مرد کر سکتے ہیں۔ ان کاموں پر مرد کو ملکہ حاصل ہے ان کاموں کی بدولت ہمارے معاشرے میں مرد کی برتری کا سکّہ چل رہا ہے۔ آپ خود ہی دیکھ لیجئے۔ آئے دن ہمارے اخباروں میں مجرمانہ حملوں اور عصمت دری کی خبریں آب و تاب سے شائع ہو رہی ہیں۔ یہ دونوں کام جوانمردی اور دلیری کے کام ہیں۔ ایک پانچ برس کے بچّے یا بچّی پر مجرمانہ حملے کی جسارت کوئی مرد ہی کر سکتا ہے! یہ کام کوئی عورت نہیں کر سکتی۔ دل گردے کا کام ہے۔ شیر کا دل چاہیئے۔ ایک پانچ برس کے بچے پر مجرمانہ حملہ کرنے کے لئے! مجرمانہ حملوں کی تمام خبروں میں آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ یہ کارنامہ کسی جوانمرد کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے! کوئی عورت پانچ برس کے بچے یا بچّی پر مجرمانہ حملہ نہیں کر سکتی۔ یہ عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بچّے کی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر ماں کو "ریپ" کرنا اور باپ کو درخت سے باندھ کر اس کی بیٹی کو "ریپ" کرنا دلیری اور بہادری کے کارنامے ہیں۔ ایسے کارناموں میں کوئی عورت کسی مرد کے ہم پلّہ نہیں ہو سکتی۔ تحقیق کر لیجئے۔ تاریخ کے کسی بھی دَور اور معاشرے میں عورت نے ریپ جیسا دلیرانہ کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ عورتیں مساوی حقوق کی باتیں تو کرتی ہیں لیکن کیا وہ ان حقوق سے انصاف کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں!

میں نہیں سمجھتا کہ مساوی حقوق مل جانے کے بعد دنیا کی کوئی عورت مرد کی طرح ریپ کا کارنامہ کر سکے گی۔ مساوی حقوق مل جانے کے باوجود وہ مرد کی طرح پانچ سال کے کسی بچے یا بچّی پر مجرمانہ حملہ نہیں کر سکے گی۔ وہ بنک نہیں لوٹ سکے گی۔ وہ ہنگامے نہیں کر سکے گی۔ وہ ہنگاموں کے دوران آگ نہیں لگا سکے گی۔ وہ جھوٹی گواہی نہیں دے سکے گی۔ وہ قتل نہیں کر سکے گی۔ وہ رشوت نہیں لے سکے گی۔ وہ خُرد بُرد کے جوہر نہیں دکھا سکے گی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ عورتیں مساوی حقوق لے کر کیا کریں گی! خواہ مخواہ اپنی کمزوری کو عیاں کریں گی۔ لہٰذا میں خواتین کی حمایت میں کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ خواتین کی حمایت میں' میں ایک لفظ نہیں لکھ سکتا۔ میں اپنے ناقد کو گھاس نہیں ڈال سکتا!



منہاج برنا



قصّے ہزار عشق کے ، اظہار بھی تو ہو
خبریں بہت ہیں شہر میں ، اخبار بھی تو ہو

بازارِ دل لگا ہے ، خریدار بھی تو ہو
ایماں شکن کوئی بُتِ دلدار بھی تو ہو

گیسو کے نرم روتے طرحدار بھی تو ہو
سجدے ہزار ، سنگِ درِ یار بھی تو ہو

وہ تیری یاد ہو کہ غمِ روزگار ہو
جینے کے واسطے کوئی آزار بھی ہو تو

درسِ وفا کی وحدتِ اضداد جان ہے
اقرار کے ثبوت میں انکار بھی تو ، ہو !

اربابِ اہلِ تیغ سے کب تک یہ قیل و قال
تلوار کے جواب میں تلوار بھی تو ہو !

یہ کیا دَورنِ خانہ تبرّا بہ شہریار
اے اہلِ خامہ، نغمہ سرِ دار بھی تو ، ہو

ہاں ہم ہیں راز دارِ مکافات روزِ حشر
بخشش سہی ، پہ کوئی گنہگار بھی تو ، ہو

پرچم اٹھا کے چل پڑا برنا تو سوئے دار
شہرِ وفا میں کوئی وضعدار بھی تو ہو

لیاقت میڈیکل کالج ہسپتال میں کیا ہو رہا ہے

غریب ہاری سے آپریشن کیلئے

دو ہزار روپے طلب کئے گئے

فالج کا مریض، اسٹاف کے رویہ سے تنگ آ کر ہسپتال سے فرار ہو گیا

امیر الدین قریشی

لیاقت میڈیکل کالج واسپتال، کراچی کے بعد پورے سندھ کا سب سے بڑا اسپتال ہے جہاں مٹھی (تھرپارکر) کشمور اور ٹھٹھہ الغرض اندرون سندھ کے تمام حصّوں سے مریض علاج کے لیے آتے ہیں یہ ہسپتال جیسا کہ نام سے ظاہر ہے میڈیکل کالج سے منسلک ہے۔ یہ ادارہ دو حصّوں پر مشتمل ہے ایک حصّہ شہر میں واقع ہے جو سول اسپتال کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا حصّہ شہر سے دس میل دور جامشورو میں واقع ہے۔

اندرون سندھ کے سب سے بڑے ہسپتال میں، جو کروڑوں روپے کی مالیت سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اور جس کا بجٹ بھی کروڑوں میں ہوتا ہے، علاج کی کتنی سہولتیں میّسر ہیں اور ان سہولتوں سے مریض کس قدر استفادہ کر رہے ہیں یہ ایک دردناک داستان ہے بلکہ ایک قومی المیہ ہے کہ اس ہسپتال کے ارباب اقتدار اسٹاف اور ادویات پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں لیکن ہسپتال کے حکام اپنی بنیادی ذمہ داری ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں چند حقائق پیش خدمت ہیں۔

آؤٹ پیشنٹ ڈیپارٹمنٹ (او پی ڈی)

یہ ڈیپارٹمنٹ شہر میں واقع ہے اسپتال میں داخلے یا عام طبی امداد کے لیے مریض کو اس ڈیپارٹمنٹ میں دکھانا ہوتا ہے یہ ڈیپارٹمنٹ مختلف امراض کے شعبہ جات میں منقسم ہے ہر شعبے میں ایک سے لیکر دو ڈاکٹر مقرر کیے گئے ہیں ڈاکٹر صاحبان کی ڈیوٹی صبح ۸ بجے سے شروع ہوتی ہے مسیحا کی آمد سے قبل ہی مریض لائنوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں گجر آٹھ بجا دیتا ہے لیکن مسیحا کا دور دور تک پتہ نہیں ہوتا۔ وہ خراماں خراماں عموماً نو بجے آتے ہیں بعض دس بجے، پھر وہ مریضوں کو دیکھنا شروع کرتے ہیں ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک یعنی ۳ گھنٹے، لیکن یہ گھنٹے بھی مریضوں پر صرف نہیں کیے جاتے، دوستوں سے گپ شپ، اخبار کا مطالعہ، چائے کی چسکی، اور کم از کم تین چار مرتبہ دوستوں سے ٹیلیفون پر مذاق کرنا بھی کیونکہ فرائض میں داخل ہوتا ہے لہٰذا ڈیوٹی کے اوقات میں ہی یہ فرائض انجام دیے جاتے ہیں۔ او پی ڈی کے شعبہ جات میں پروفیسر صاحبان بھی موجود ہوتے ہیں اور یہ بھی مریضوں کا معائنہ کرتے ہیں لیکن ہر کس و ناکس کا نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ پہلے مریض ڈاکٹر سے معائنہ کرائے اور اگر ڈاکٹر ضروری اور مناسب سمجھتا ہے کہ مریض کا معائنہ پروفیسر بھی کرے تو ڈاکٹر اسے "پروفیسر" کو ریفر کرتا ہے۔ اور ڈاکٹر حضرات انہی مریضوں کو "ریفر" کرنا "ضروری اور مناسب" سمجھتے ہیں جو ان کے واقف کار ہوں میڈیکل اسٹوڈنٹس یا ہسپتال کے اسٹاف کے دوست ہوں یا ان کے پاس تگڑی سفارش ہو۔ اور اگر یہ سب کچھ نہیں تو جیب کا بھاری ہونا ضروری ہے عموماً ایسا ہوتا ہے کہ مریض کی حالت بہت نازک ہے اور وہ ڈاکٹر سے منّت کرتا ہے کہ اسے پروفیسر کے پاس "ریفر" کیا جائے مگر جواب میں اسے ڈانٹ پلائی جاتی ہے اور اسے اے پی سی، مکسچر یا معمولی گولیاں دے کر ٹرخا دیا ہے۔

اسی نوعیت کا ایک واقعہ گوٹھ حبیب خان بھرگڑی کے محمد حنیف کے ساتھ پیش آیا۔ یہ گاؤں حیدرآباد سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے حنیف ایک ہاری ہے اس کے دونوں کان بہتے ہیں اور اسے بالکل سنائی نہیں دیتا اوپی ڈی کے ڈاکٹر نے یہ جانتے ہوئے کہ حنیف کے کانوں کے پردوں میں سوراخ ہو گئے ہیں اور اس کے لیے آپریشن بہت ضروری بلکہ لازمی ہے۔ اور آپریشن کے لیے پروفیسر حکم دے گا حنیف کا کیس پروفیسر کو ریفر نہیں کیا۔ بلکہ پندرہ دن تک ایک معمولی پاؤڈر ڈلوانے کے لیے اسے او پی ڈی کے چکر لگوا تا رہا۔ حنیف روزانہ اپنے گاؤں جاتا اور صبح سویرے حیدرآباد آتا۔ پندرہ دن تک چکر لگانے کے بعد جب حنیف نے دوبارہ اسی ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے معمولی دوائی لکھ کر اسے ٹرخا دیا۔ اور کہا کہ ایک ماہ کے بعد آنا۔" آخر وہی ہوا جو ڈاکٹر چاہتا تھا۔ پروفیسر کا چپراسی حنیف کو ایک کونے میں لے گیا اور مشورہ دیا کہ "شام کو صاحب کے کلینک چلے جانا وہ علاج کر دیں گے ورنہ ساری عمر چکّر ہی

لٹکتے رہو گے" چنانچہ غریب ہاری کلینک گیا چالیس روپے فیس دے کر معائنہ کرایا، اسے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا گیا۔ اور اس کے لیے دو ہزار طلب کیے گئے۔ غریب ہاری کے پاس دو ہزار کہاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ ضعیف خاموشی سے گاؤں واپس چلا گیا اس یقین کے ساتھ کہ وہ ساری عمر محنت کرنے کے باوجود آپریشن نہیں کرا سکے گا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ شعبہ جراحی میں کشمور کے رہنے والے اللہ ودھایو کے ساتھ پیش آیا۔ اللہ ودھایو دو سال سے پیٹ کے درد میں مبتلا ہے جب اس نے او پی ڈی کے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے لال دوا پر ٹرخا دیا اللہ ودھایو نے جب لال دوا دیکھی تو ڈاکٹر کے پاس گیا "سائیں یہ دوا تو میں ایک مہینے سے پی رہا ہوں مہربانی کر کے مجھے بڑے ڈاکٹر کے پاس بھیج دو" وہ بے شمار مریضوں کی موجودگی میں ڈاکٹر کے پیروں میں گر گیا مگر ڈاکٹر نے اسے پروفیسر کو ریفر کرنے کے بجائے چپراسی کے ہاتھوں دھکے دے کر باہر نکلوا دیا۔ او پی ڈی میں روزانہ آپ کو ایسے بیسیوں لوگ نظر آئیں گے جو تین تین سو میل دور سے آتے ہیں اور یہاں کے ڈاکٹروں کی مہربانیوں کے طفیل دو دو چار آنے والی گولیاں لے کر چلے جاتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے ایسے لوگ دوپہر تک میں مریض کو ڈالے او پی ڈی میں چکر لگاتے ہوئے نظر آئیں گے انہیں یہ تک پتہ نہیں ہوتا کہ پرچی کہاں سے بنے گی اور کیسے بنے گی۔ کرنے اور کس شعبے میں مریض کو دکھانا ہے ایکسرے کہاں ہوگا، لیباٹری کہاں ہے ڈاکٹر تو دور کی بات ہے ہسپتال کے چوکیداروں اور چپراسیوں کا رویہ بھی انتہائی خراب ہوتا ہے خاص طور سے دیہات کے لوگوں سے

ادویات کے مراکز

دواؤں کے لیے دو طرح کے اسٹور ہیں ایک اسٹور او پی ڈی میں اور دوسرا ہسپتال میں ان اسٹوروں کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ او پی ڈی کے اسٹور میں چار آنے تک اور اسپتال کے اسٹور میں آٹھ آنے تک کی گولیاں مل جاتی ہیں لال دواؤں کا کیا معیار ہوتا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے حد ہے کہ سیلاب میں امداد کے لئے ملی ہوئی دوائیں جو بالکل بے کار ہو چکی ہیں مریضوں میں تقسیم کی جاتی ہیں جن سے ٹھیک ہونے کے بجائے بیمار ہونے کا زیادہ خطرہ ہے اس کے علاوہ اگر کوئی مہنگی دوا ہے تو وہ بازار سے خریدنی پڑتی ہے یہاں تک کہ وارڈ میں داخل مریض بھی بازار سے دوا منگوایا کرتے ہیں دواؤں کی کمی کا یہ عالم ہے کہ اسپتال میں انجکشن لگانے کا اسپرٹ تک موجود نہیں ہوتی ہے۔ گرم پانی سے کام چلایا جاتا ہے بینڈیج اور پلاسٹر موجود نہیں ہے ٹیپ اور کترن سے کام نکالا جاتا ہے

ایکسرے ڈیپارٹمنٹ

اس شعبے کا بیشتر عملہ ناتجربے کار ہے او پی ڈی سے لکھے گئے۔ ایکسرے کے پیسے لیے جاتے ہیں مگر جان پہچان ہو تو نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

لیبارٹری

اس ہسپتال کی لیبارٹری بلاشبہ دنیا کی خطرناک ترین لیبارٹری ہے جہاں ٹیسٹ کرانا اپنے گلے میں پھندا ڈالنے کے مترادف ہے۔

وارڈ

ہسپتال کا بڑا حصہ وارڈز پر مشتمل ہے اور سب سے زیادہ خراب حالت بھی انہی وارڈز کی ہے۔

یہ جامشورو کا وارڈ نمبر ۱ ہے یہاں کے ٹوائلٹ میں ایک بھی بلب موجود نہیں ہے نلکے ٹوٹے ہوئے ہیں زنجیریں خراب ہیں۔ دروازوں کی کنڈیاں غائب ہیں مریض ضرورت کے وقت ماچس لے کر جاتے ہیں بستروں کی چادریں بیس بیس دن تک بدلی نہیں جاتیں پینے کے پانی کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔

یہ وارڈ نمبر ۱۳ ہے یہاں بدبو اس قدر ہے کہ ناک پر رومال رکھے بغیر آپ اندر داخل نہیں ہوسکتے ہیں ٹوائلٹ تو چھوڑیئے وارڈ کے بلب بھی غائب ہیں سارے وارڈ میں موت کی سی ویرانی چھائی ہوئی ہے

یہ سرجیکل وارڈ نمبر ۵ ہے کونے میں ایک مریض شدت درد سے چلا رہا ہے اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نرس سے گپ شپ میں مصروف ہے۔

یہ میڈیکل وارڈ نمبر ۳ ہے یہاں ایک وارڈ بوائے مریض کو دھتکار رہا ہے مریض نے اس سے پینے کے لیے ٹھنڈا پانی مانگا تھا۔ ویسے گرمیوں میں پورے وارڈ کے لیے برف آتی ہے مگر وہ صرف ڈاکٹر اور اسٹاف کے ارکان استعمال کرتے ہیں۔ وارڈ بوائے کا کام مریضوں کا کام کاج کرنا ہوتا ہے مگر وہ صرف ڈاکٹروں کی تابعداری میں آتے ہیں

یہ وارڈ نمبر ۱۱ ہے یہاں کونے کے بستر پر ہنڈو غلام علی کی ایک مریضہ داخل ہے اس کی ٹانگ کٹنی ہے ساتھ ساتھ اسے شوگر کی بیماری ہے مگر جب سے وہ داخل ہوئی ہے کھانے میں اسے چاول اور دودھ دیا جاتا ہے کسی کو پرواہ نہیں ہے۔ کھانے کا ذکر آیا تو یہ بیان کرتا چلوں کہ مریض تو دور کی بات ہے جانور بھی ہسپتال کے کھانے کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ ۵۰ فیصد مریض باہر ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔ ہسپتال کا کھانا صرف غریب مریض ہی کھاتے ہیں کھانے میں اُبلے ہوئے چاول، انتہائی گھٹیا درجے کے، جلی ہوئی روٹیاں اور نمک مرچ کے گرم پانی میں تیرتی ہوئی لوکی یا پالک ہوتا ہے ناشتے میں کھلی ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے اور ایک کپ چائے جس میں سے مٹی کے تیل کی بدبو آتی ہے۔ بعض مریضوں کی خوراک میں دودھ بھی لکھا جاتا ہے مگر یہاں مریضوں کو نہیں ملتا ہے بلکہ اس سے سارا دن ڈاکٹر صاحبان کی چائے بنتی ہے

یہ بچوں کا وارڈ ہے گندگی ہے کہ خدا کی پناہ! ایک کونے سے بچے کے چیخنے کی آواز آرہی ہے پاس جا کر دیکھیں کیا بات ہے دو نرسیں ایک تین سالہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے ربڑ کی ایک نالی زبردستی اس کی ناک میں گھسیڑ رہی ہیں۔ اس زور آزمائی میں نلکی تو اندر داخل ہوگئی مگر بچے کی ناک سے خون بہنے لگا۔ یاد رہے یہ نلکی ابھی دوسرے بچے کی ناک سے نکالی گئی ہے اور بغیر دھوئے دوبارہ استعمال کی جا رہی ہے۔

وارڈ سے مریض دو صورتوں میں رخصت ہوتا ہے اول یہ کہ مریض جان چھڑا کر بھاگ جائے، جو بھاگنے سے قاصر ہوتے ہیں یا فضول امید رکھتے ہیں انہیں دوسری صورت میں نہ صرف ہسپتال بلکہ اس دنیا سے بھی بھگا دیتے ہیں اسی طرح کا ایک واقعہ ٹنڈو محمد خان کے بس اسٹینڈ پر پان کی ماڈل والے سلیمان بھٹی کے ساتھ پیش آیا۔ یہ شخص ٹانگوں کے فالج کے علاج کی غرض سے ایک ماہ سے وارڈ میں داخل تھا فالج کا مرض ناقابل علاج نہیں مگر یہاں ایک تو سہولتیں میسر نہیں دوسرے مریضوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا ہے لہذا سلیمان بھٹی کی حالت ٹھیک ہونے کے بجائے دن بدن خراب ہوتی چلی گئی آخر کار جب وہ یہ سمجھ گیا کہ وہ کچھ دن اور ہسپتال میں رہا تو زندہ نہیں رہے گا۔ تو اس نے وارڈ بوائے کو دس روپے دیئے کہ ہسپتال سے باہر بس تک پہنچا دو۔ وارڈ بوائے کی مدد سے وہ بس میں بیٹھا اور گھر واپس آ گیا۔

ایک دن ایک دوست کو اتفاقاً ٹیلیفون لائن مل گئی۔ رات ایک بجے کا وقت ہے ہونے والی گفتگو

ذرا سنیے۔ "ہیلو کون سسٹر! کیا حال ہے" دوسری جانب سے سسٹر بولی "سر وہ کئی دفعہ میں نے آپ کو فون کیا اور وارڈ بوائے کو بھی بھیجا آپ تھے ہی نہیں"

"ہم ذرا چھاٹک پر گوشت کھانے گئے تھے کیوں خیر تو ہے" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"وہ دس نمبر مریض کی حالت اچانک خراب ہوگئی اور وہ پندرہ منٹ کے اندر اندر مر گیا ہے" سسٹر نے کہا۔

"اچھا مر گیا! چلو کوئی بات نہیں جان چھٹی ایک مہینے سے تنگ کر رہا تھا۔" دونوں طرف سے قہقہے۔

شعبہ امراض قلب میں ۶ مئی کو ٹنڈو اللہ یار کے جان محمد عباسی کو داخل کرایا گیا۔ ۱۶ مئی کو حسب معمول کے مطابق انہیں گلوکوز کی بوتل لگائی گئی تو اچانک ان کی حالت خراب ہوگئی۔ مریض کے رشتہ داروں کی منتوں کے باوجود اسٹاف نے ڈاکٹر کو بلانے سے انکار کر دیا مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب اور گلوکوز کی بوتل کے ری ایکشن کی وجہ سے جان محمد عباسی کا آدھے گھنٹے کے اندر اندر انتقال ہو گیا

ہسپتال میں زیادہ اموات رات کو ہوتی ہیں

۱۹۷۷ء میں ہسپتال میں اموات کا چارٹ کچھ اس طرح ہے۔

وقت	تعداد
صبح ۸ سے ۲ بجے دوپہر تک	۷۱
۲ سے رات ۸ بجے تک	۷۶
(وقت نہیں لکھا ہوا)	۳۴
رات ۸ سے صبح ۸ بجے تک	۱۶۶
کل اموات	۳۴۷

ریکارڈ کے مطابق ایک سال میں کل ۳۴۷ اموات واقع ہوئیں لیکن اس میں وہ اموات درج نہیں ہیں جو ڈاکٹر کسی بھی وجہ سے لکھوانا پسند نہیں کرتے۔ چارٹ کے مطابق زیادہ اموات رات کے وقت ہوئیں جب ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہونے کے باوجود اوپر فلیٹوں میں سوئے ہوتے ہیں یا پھر گھر چلے جاتے ہیں۔

مریض کیوں مرا، کس کی لاپرواہی سے مرا کوئی پوچھ گچھ کرنے والا نہیں ہے۔ بھٹو کے قتل پر اس قدر شور اور قاتلوں کو پھانسی کی سزائیں دی گئیں مگر یہاں روزانہ نہ جانے کتنے بے پرواہ ترنم ڈاکٹروں کی لاپرواہی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

ہسپتال کے قوانین کے مطابق لاش اس کے گھر تک بلامعاوضہ لے جانے کا انتظام ہے مگر سفید جھوٹ ہے آج تک ایسا نہیں ہوا۔ لہٰذا جن کے پاس پیسے ہوتے ہیں وہ پرائیویٹ گاڑیوں میں لاش لے جاتے ہیں۔ ورنہ مٹھی گرم کر کے ایمبولینس حاصل کرتے ہیں

ہسپتال کے بجٹ میں لاکھوں کے غبن، آپریشن تھیٹر میں ہونے والے واقعات' آئے دن ہسپتال سے قیمتی اشیاء کی چوری، بلڈ بنک میں دھاندلیاں، نرسوں اور ڈاکٹروں کے اسکینڈل' نچلے عملے کی حالت زار' علیحدہ اور مفصل موضوع ہیں جو پھر کبھی سہی۔

گندم کی فصل اچھی ہونے کا سرکاری دعویٰ سفید جھوٹ ہے

میاں محمد شریف زاہد

"پنجاب-۷۶" نامی بیج ناقص ہے، انجمن کاشتکاران پنجاب

انجمن کاشتکاران پنجاب کا ایک خصوصی اجلاس کسان ہال لاہور میں منعقد ہوا جس کی صدارت مفتی ضیاء الحسن نے کی اجلاس سے سید افتخار احمد رضا شیخوپورہ، چودھری محمد اسحٰق تارڑ وہاڑی، رانا افتخار احمد خانیوال، خان سعید اللہ خان میانوالی، ملک احمد علی احمد لک لیہ، چوہدری محمد اقبال جاڑا ایڈووکیٹ منڈی بہاؤالدین ملک عیسیٰ خان جھنگ اور چوہدری ہارون الرشید تحصیل حافظ آباد نے خطاب کیا۔

اجلاس میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ انجمن نے حکومت کو اس سال گندم کی فصل کی کاشت اور پیداوار میں کمی کے متعلق واضح طور پر بتا دیا تھا لیکن حکومتی مشیروں کی جانب سے نہ صرف گندم کی فصل زیادہ پیدا ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے بلکہ اس امر کا برملا اظہار کیا جا رہا ہے کہ ہمارا ملک گندم میں خود کفیل ہو گیا ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ بالکل لغو اور جھوٹ ہے گندم کی پیداوار اس سال مارکس کن حد تک کم ہوئی ہے حکومت کی جانب سے منظور شدہ گندم کے بیج "پنجاب ۷۶" کی پیداواری خوبی کا ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعے زبردست پروپیگنڈہ کیا گیا۔ حالانکہ اس بیج کے پیداواری نتائج بہتر برآمد نہیں ہوئے ہیں اس کے برعکس بکوڑا بیج "کے بہتر نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اجلاس میں اس امر کا اظہار کیا گیا کہ آئندہ سال کے لئے بہتر نتائج کی حامل گندم کے بیج کی درآمد وقت کا اہم ترین تقاضا ہے

اجلاس میں متعدد قراردادیں اتفاق رائے سے منظور کی گئیں جن میں مطالبہ کیا گیا کہ ان عوامل کی تحقیقات کرائی جائے جن کی بنا پر منظور شدہ گندم کا بیج "پنجاب ۷۶" پیداواری نتائج کے لحاظ سے ناکام رہا۔ زیر تعمیر سڑکوں کو فوری طور پر مکمل کیا جائے۔ مفاد عامہ کی جگہوں اور کاشتکاروں کی اراضی پر ناجائز قبضوں کو ختم کر کے مسلسل ناانصافیوں سے نجات دلائی جائے، گھوڑی پال، سانڈ پال اور دوسری اسکیموں کے تحت الاٹ شدہ سرکاری اراضی کے حقوق ملکیت دیئے جائیں۔ چشمہ بیراج کے متاثرین کو بلاتاخیر متبادل اراضی دی جائے۔ ٹیوب ویلوں کے لئے واپڈا کی جانب سے ساڑھے سات ہزار روپے کی رعایت میں اضافہ کر کے ۲۵ ہزار روپے تک توسیع کی جائے کپاس کے بیج اور کھاد کی بوریوں میں وزن کی کمی کی شکایات کا ازالہ کیا جائے دھان کی فصل پر موثر ادویہ کی جامع اسپرے اسکیم شروع کی جائے تاکہ دھان کی آئندہ فصل بہتر ہو سکے۔ الکا اسپرے کی قیمت خریف کے ملیے کے ساتھ وصول کی جائے ہر قسم کے زرعی ٹیکس کی تنسیخ کی جائے گزشتہ تین فصلوں کے مالیے کی رقم مختلف اقساط میں وصول کی جائے۔

عدالتی کارروائی کے بائیکاٹ اور وکلاء کے مختارناموں کی منسوخی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

عدالت نے بچاؤ مہم سے استغاثے کے مقدمے میں خلا کو پُر کیا ہے



سپریم کورٹ آف پاکستان میں بھٹو کی اپیل (آخری قسط)

(۵۲) اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ معزز عدالت ازراہِ کرم محسوس کرے گی کہ دو ماہ سے زیادہ عرصے تک کھلی عدالت میں اپنی بات کہنے اور قانون اور مقدمے کی منصفانہ کارروائی کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق اپنا دفاع کرنے کے قابل ہونے کی ہر کوشش کرنے کے بعد اپیل کنندہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ کارروائی کا مقاطعہ کرے۔ اپیل کنندہ کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا گیا تھا کہ اپنے وکلا کے مختار نامے منسوخ کرے اور مورخہ ۹ جنوری ۱۹۷۸ء سے کارروائی کا مقاطعہ کرے۔ اسے کوئی موقع ہی فراہم نہیں کیا گیا کہ مقدمے کے اہم نکات کے بارے میں اپنا موقف ریکارڈ پر لا سکے۔ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۲۵۶۔ جی میں مندرج واضح احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، گو کہ اس نے صفائی میں کوئی شہادت پیش نہیں کی تھی، وکیل سرکار کی بحث کے بعد اسے مقدمے پر بحث کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

(۵۳) اس معزز عدالت نے مقدمہ محمد اسمٰعیل چوہدری بنام عبدالخالق پی ایل ڈی ۱۹۶۰ء سپریم کورٹ ۳۰۱۔ (۳۰۶) میں فیصلہ صادر کیا ہے۔

"سماعت کرنے والے جج کے ذہن میں تعصب کا اثر ان کی طرف چلائی اور تکمیل کی گئی مقدمے کی کارروائی کے ہر حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ تصحیح کرنے والی کسی اعلیٰ عدالت کے لئے یہ ناممکن ہے کہ ایسے کسی جج کے مرتب کردہ ریکارڈ اور شہادت کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکے۔ تمام کارروائی پر مکمل اختیار رکھتے ہوئے وہ اس موقف میں ہے کہ گواہوں کے بیانات اور جرح کی نہج پر اس طرح اثر انداز ہو کر وہ نتیجہ برآمد ہو جس کی طرف اس کا تعصب اس کی رہنمائی کرتا ہو، لیکن طریقہ ہائے کار مکمل طور پر

مقدمے کی تمام کارروائی اور اس کا نتیجہ مہمل ہے

پوشیدہ ہیں۔ نتیجتہً اعلیٰ عدالت کے لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ یہ امتیاز کر سکے کہ سماعت کرنے والے جج کے تعصب سے کارروائی کا کون سا حصہ متاثر ہوا ہے۔ اکثر ایک متعصب جج کا رویّہ ہی یہ متعین کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے کہ اس کے سامنے پیش ہونے والے گواہوں کی دی ہوئی شہادت کی نوعیت کیا تھی۔ ان سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ یکسوئی کے ساتھ سچائی پر قائم رہتے ہوئے آزادی کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ سکیں اگر وہ اس بات سے آگاہ ہوں کہ عدالت مقدمے کو کس سمت میں لے جانے کی خواہشمند ہے۔"

مودبانہ گذارش ہے کہ زیرِ نظر مقدمے میں سماعت کرنے والی بینچ گواہوں کے بیانات اور جرح کی نہج پر اثر انداز ہوئی ہے اور سماعت کرنے والی بینچ کے متعصبانہ رویّے نے اس کے سامنے پیش ہونے والے گواہوں کی شہادت کی نوعیت کا تعین کیا ہے۔ گواہوں نے اس آگاہی کی بنا پر کہ سماعت کرنے والی بینچ مقدمے کو کس سمت لے جانا چاہتی ہے یکسوئی کے ساتھ سچائی پر قائم رہتے ہوئے اپنے دل کی بات آزادی کے ساتھ نہیں کہی ہے۔ مقدمے کی تمام کارروائی اور اس کا نتیجہ مہمل ہے۔

ذیل میں چند واقعات پیش ہیں جو اس "بچاؤ مہم" کو ظاہر کرتے ہیں جو سماعت کرنے والی بینچ نے استغاثے کے حق میں چلائی۔

(۱) جب استغاثے کے گواہ احمد رضا قصوری پر جرح ہو رہی تھی تو ان سے حسبِ ذیل سوال پوچھا گیا (شہادت کے ریکارڈ کا صفحہ ۳۷)

سوال: "کیا آپ نے ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کے واقعے سے متعلق ایف آئی آر میں یہ ذکر کیا تھا کہ حملہ مسٹر بھٹو کی ایما پر کیا گیا تھا؟"

جواب: "میں نے ذکر کیا تھا۔"

ایف آئی آر۔ ای ایکس ۱/۳۴ (عدالت میں پیش کردہ دستاویزات کی جلد کا صفحہ ۸۰) ساتھ ہی ساتھ قصوری کی تحریر جس سے ایف آئی آر لکھی گئی تھی۔ ای ایکس ۲/۱ (عدالت میں پیش کردہ دستاویزات کی جلد کا صفحہ ۳) میں مذکور نہیں ہے کہ حملہ مسٹر بھٹو کی ایما پر کیا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ استغاثے کا مقدمہ گرداب میں پھنس گیا ہے عدالت نے مداخلت کی۔

عدالت سے: مسٹر احمد رضا قصوری کیا آپ ایف آئی آر پر ایک نظر ڈالیں گے اور نشاندہی کریں گے کہ آیا یہ وہاں موجود ہے؟

جواب: یہ ایف آئی آر کے پہلے پیراگراف کی آخری پانچ سطروں سے ظاہر ہے جو "A" سے شروع ہوتی ہیں اور "A" پر ختم ہوتی ہیں۔ یہ میرا کہنے کا انداز تھا کہ اس واقعے میں مسٹر بھٹو کا ہاتھ تھا۔"

(ii) اس کے بعد احمد رضا قصوری کا اس سابقہ بیان سے سامنا کرایا گیا جو انہوں نے مبیّنہ محرک کے بارے میں ٹریبونل کے سامنے دیا تھا اور جو ٹریبونل کی رپورٹ پیراگراف ۱۵ میں موجود ہے۔ اس پر سماعت کرنے والی بینچ نے حسبِ ذیل حکم صادر کیا جو شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۳۹ پر موجود ہے۔

مسٹر احسان قادر گواہ کا اس بیان سے سامنا کروانا چاہتے ہیں جس کا حوالہ ایک انکوائری آفیسر کی رپورٹ میں ہے، گو کہ اس انکوائری کمیشن کے روبرو اس گواہ کے بیان کی ایک نقل انہیں ہمارے حکم کے تحت فراہم کی گئی ہے۔ قانونِ شہادت کے تحت یہ جائز نہیں ہے اور ہم یہ سوال پوچھنے کی اجازت دینے سے انکار کرتے ہیں۔"

(iii) شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۷۶ پر استغاثے کے گواہ نمبر ۲ مسعود محمود نے وزیر اعظم کی طرف سے اپنے فرائض کی مبیّنہ زبانی نوعیت بیان کرتے ہوئے صرف یہ کہا ہے کہ:

"وزیر اعظم یہ چاہتے تھے کہ فورس ان کو سیاسی مقاصد کے لئے دستیاب رہے۔"

جب جواب قلم بند ہو گیا تو اس کے بعد وکیل

استغاثہ نے ایک اعتراض اٹھایا جس کی نوعیت کا پتہ تو ریکارڈ پر نہیں ہے۔ اس کے نتیجے میں گواہ نے حسب ذیل جواب دیا۔

" وزیراعظم سے ملاقات کے دو گھنٹے بعد ہدایات سے جو مطلب میں نے لیا یہ تھا کہ ایف ایس ایف وزیراعظم کے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے آلۂ کار (مسٹر ڈی۔ ایم اعوان عرض گزار رہے کہ اولاً گواہ نے لفظ "آلۂ کار" استعمال نہیں کیا تھا) کے طور پر استعمال ہونے والی تھی ان میں یہ مقاصد بھی شامل تھے۔

(ا) سیاسی جلسوں کو منتشر کرنا۔

(ب) خود ان کی اپنی پارٹی اور حزب اختلاف کے لوگوں کو ہراساں کرنا۔

(پ) جن عام جلسوں سے وہ خطاب کرتے ان میں مجمع بڑھانے کے لئے سادہ لباس میں لوگوں کو بھیجنا۔

" سادہ لباس میں لوگوں سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو ایف ایس ایف میں ملازم تھے۔ مجھے پراسی جگہ موجود رہنے کی ہدایات دی گئی تھیں جہاں جہاں وزیراعظم جاتے مجھے کو یہ بھی ہدایت دی گئی تھی کہ میں ان اوقات میں قومی اسمبلی کے چیمبرز میں موجود رہوں جن میں وزیراعظم اجلاس میں شریک ہو رہے ہوں یا وہ قومی اسمبلی میں اپنے چیمبر میں ہوں!"

(ت) جرح کے دوران استغاثے کے گواہ ۲ مسعود محمود سے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۱۳۶ پر حسب ذیل سوال پوچھا گیا۔

" سوال۔ وہ افراد کون تھے جنہوں نے آپ کو حراست میں لیا تھا؟"

یہ بات عام طور پر علم میں تھی کہ مارشل لاء حکام نے مسعود محمود کو بغاوت کے دن یعنی ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو حراست میں لیا تھا۔ اور اس سوال کے جواب سے استغاثے کے مقدمے کو نقصان پہنچتا۔ سماعت کرنے والی بینچ نے گواہ کو اس سوال کا جواب دینے سے روک دیا۔

بہرحال ایک اور سوال کا گواہ نے جواب دیا کہ

" باوردی فوجیوں نے مجھے حراست میں لیا تھا۔"

سماعت کرنے والی بینچ ایک بار پھر اس سوال کی اجازت نہیں دی۔

" سوال۔ کیا آپ نے پوچھا کہ آپ کو حراست میں کیوں لیا گیا تھا؟"

(یہ سوال متعلق نہیں ہے اور مسترد کیا جاتا ہے)

" سوال۔ کیا آپ کو پتہ چلا کہ آپ کو مارشل لاء حکام نے کیوں حراست میں لیا تھا؟"

(سوال مسترد کیا جاتا ہے کیونکہ غیر متعلق ہے)

" سوال۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ مارشل لاء حکام نے آپ کو مارشل لاء آرڈر ۱۲ کے تحت حراست میں لیا تھا"

یہ سوال غیر متعلق ہے اور ویسے بھی گمراہ کن ہے کیونکہ جس روز انہیں حراست میں لیا گیا اس روز تک مارشل لاء آرڈر ۱۲ جاری بھی نہیں ہوا تھا۔ فاضل وکیل کو یہ بتایا گیا لیکن انہوں نے اپنا اصرار جاری رکھا۔ ملزم نے خود کھڑے ہو کر کہا کہ اس روز مارشل لاء آرڈر ۱۲ جاری نہیں ہوا تھا اور مسٹر اعوان کو یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔"

اس ضمن میں مزید سوالات قلمبند بھی نہیں کئے گئے یہ سوالات تھے

(متفرق درخواستوں کی جلد کا صفحہ ۱۴۰)



سوال: آپ کس وقت گرفتار ہوئے تھے؟

سوال: کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو کیوں گرفتار کیا گیا تھا؟

سوال: کیا آپ کو کسی جرم کے ارتکاب کی بناء پر حراست میں لیا گیا تھا؟

متفرق احکام کی جلد کے صفحے ۱۳۷ سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ مزید سوالات قلم بند کئے بغیر اور کوئی سبب بتائے بغیر مسترد کر دیئے گئے تھے۔

(۷) شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۹۲ پر استغاثے کے گواہ ۲۔ مسعود محمود نے ایک جھوٹا بیان دیا کہ سیکرٹری ڈیفنس کی طرف سے جام صادق علی کو اسلحہ کی غیر قانونی فراہمی ان کے علم میں آئی تھی اور اسی لئے ان کا "سزائی اسامی" پر تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ جب اس نکتے پر جرح کی گئی تو ان کے سامنے یہ بات رکھی گئی، شہادت کے ریکارڈ کا صفحہ ۱۱۳۔ لیکن اسے بھی مسترد کر دیا گیا۔

" سوال۔ میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ نے اسلحہ کی فراہمی کی ایک باقاعدہ سرکاری لین دین کو ظاہر کر کے اور یہ کہہ کر کہ یہ ایک خفیہ لین دین تھا، سنسنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟

(نوٹ: سوال مسترد کیا جاتا ہے کیونکہ اس کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں)

(ز) استغاثے کے گواہ ۲ مسعود محمود پر اس نکتے پر جرح کی گئی کہ آیا انہوں نے انہیں دی جانے والی معافی کی شرائط کے مطابق مکمل اور سچا انکشاف کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ انہوں نے عدالت کے (سماعت کرنے والی بینچ کے) رُوبرو ایسا کیا ہے۔ ان سے مزید سوال کیا گیا کہ انہوں نے معافی ملنے کے بعد مجسٹریٹ کے رُوبرو مکمل اور سچا انکشاف کیا تھا۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ معافی کے لئے ان کی درخواست یہ نہیں کہتی ہے کہ وہ مجسٹریٹ کے رُوبرو مکمل اور سچا انکشاف کریں گے۔ تب اُن سے یہ سوال پوچھا گیا جو شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۱۴۴ پر موجود ہے۔

" سوال۔ کیا آپ مقدمے کی کارروائی کے دوران اس عدالت کے رُوبرو بیان اور سرکاری گواہ کے طور پر مجسٹریٹ کے رُوبرو اپنے بیان میں امتیاز کر سکتے ہیں؟

اُن کا جواب تھا۔ " میرا ایسا ہی اندازہ ہے۔"

سیاق و سباق میں یہ ایک اثباتی جواب تھا اور اسی لئے ان سے حسب ذیل اگلا سوال پوچھا گیا۔

" سوال۔ اپنے اندازے پر انحصار کرتے ہوئے کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ آپ نے اپنے اقبالی بیان میں دیئے گئے ٹھوس واقعات میں اضافہ کرتے ہوئے سلطانی گواہ کے طور پر بیان دیتے ہوئے چند ٹھوس واقعات کا انکشاف کیا؟

حکم: یہ سوال مسترد کیا جاتا ہے کیونکہ قانون کے تحت صرف حقائق کے بیان کی اجازت ہے اور اندازوں کے نتائج کی نہیں۔"

جو نتیجہ برآمد ہوا یہ تھا کہ اس گواہ سے جو مزید سوالات کئے گئے اس سے انہوں نے کامیابی کے ساتھ گریز کیا اور گواہ کا اختیار کردہ یہ موقف حاوی آ گیا کہ انہوں

عدالت نے نہ صرف شہادت میں گڑبڑ کی ہے بلکہ اس میں اضافہ کیا ہے

نے معافی ملنے کے بعد یہ ذمہ نہیں لیا تھا کہ مجسٹریٹ کے رُوبرو مکمل اور سچا انکشاف کریں گے اور ان تضادات کی پردہ پوشی ہو گئی جو فروگذاشتوں اور سابقہ بیانات میں اضافے کی صورت میں تھے جستزدشدہ سوالات کے جوابات یہ بھی ظاہر کر سکتے تھے کہ معافی ملنے کے بعد مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۷۷ء کو مجسٹریٹ کے رُوبرو دیا گیا۔ بیان اس اقبالی بیان کی تقریباً ہو بہو نقل تھا جو مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۷۸ء کو مجسٹریٹ کے روبرو دیا گیا تھا اور یہ کہ ان بیانات کی فروگذاشتوں اور ان میں وہ اضافے جو انہوں نے عدالت کے روبرو بیان دیتے وقت کئے اعلانیہ جھوٹے تھے جن کی ضرورت استغاثے کے مقدمے میں تبدیلی کی وجہ سے پیش آئی۔

(vii) استغاثے کے گواہ ۲ سے شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۶۷ پر اس حقیقت کے بارے میں سوال پوچھا گیا کہ ایوانِ وزیر اعظم میں وزیر اعظم سے تمام ملاقاتوں کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا یہ سوال ضروری تھا۔ کیونکہ گواہ نے یہ الزام لگایا تھا کہ "۱۹۷۴ء کے وسط میں" وزیر اعظم سے ان کی ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات میں وزیر اعظم نے انہیں مبیّنہ طور پر مسعود محمود کو یاددہانی کرانے کا فرض سونپا تھا۔ لیکن سماعت کرنے والی عدالت نے یہ سوال پوچھنے کی اجازت نہیں دی۔ سوال اور عدالت کا حکم ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"سوال۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ وزیر اعظم جو ملاقاتیں کرتے تھے وہ سب کی سب ریکارڈ کی جاتی تھیں یا ان کا اندراج کیا جاتا تھا؟"

(حکم: یہ نہیں کہا گیا ہے کہ گواہ یہ ریکارڈ رکھتا تھا یا ایسا ریکارڈ رکھنے کی نگرانی کرتا تھا یا یہ کہ اسے کوئی اندراج کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے اس سوال کی اجازت نہیں دی جاتی)۔

مودبانہ التماس ہے کہ اس سوال کا تعلق ایوانِ وزیر اعظم جہاں گواہ خود کام کر رہا تھا کے مروّجہ طریقے کے بارے میں اس کے علم سے تھا۔ اگر گواہ کو اس سوال کا جواب دینے کی اجازت دی جاتی تو وزیر اعظم سے ملاقات کرنے کا اس کا دعویٰ باطل ہو جاتا۔

(viii) استغاثے کے گواہ ۴۔ ایم آر ویلش نے شہادت کے ریکارڈ کے صفحے ۲۸۷ پر کہا تھا کہ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۴ء سے ایک یا دو روز پہلے مسعود محمود نے انہیں ٹیلی فون کیا اور کہا کہ قصوری کوئٹے کا دورہ کر رہے تھے اور ان کا "خیال رکھا جائے" اور "۴ جولائی ۱۹۷۴ء میں مسعود محمود سے گفتگو کے سیاق و سباق میں جب انہوں نے "مسٹر قصوری کا خیال رکھئے" کا حوالہ دیا تو اس کا مطلب ان کا خاتمہ تھا"۔

سماعت کرنے والی بینچ نے فوری مداخلت کی اور ان سے حسب ذیل سوال پوچھا۔

"سوال۔ "خاتمہ" سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

جیسا کہ سماعت کرنے والی بینچ کو توقع تھی، جواب تھا۔

"اس کا مطلب ان کا قتل تھا"۔

اس طرح عدالت اس "بچاؤ مہم" سے استغاثے کے مقدمے میں خلا کو پُر کیا۔

(ix) استغاثے کے گواہ ۱۰۔ ذوالفقار علی طور پر مسٹر اعوان اور میاں قربان صادق اکرام کی جرح کے دوران یہ ثابت ہو گیا کہ گواہ نے اقبالی بیانات قلم بند کرنے سے قبل ضروری قانونی پیشگی شرائط کی تکمیل نہیں کی تھی۔ تب اقبالی ملزم کی نمائندگی کرنے والے مسٹر ارشاد قریشی نے جو سرکاری وکیل کے شریک کار کے طور پر کام کر رہے تھے۔ دفاع کرنے والے ملزم کے وکیل کی جرح کے اثر کو زائل کرنے کے لئے اپنی جرح میں وہ سوالات کئے جو شہادت کے ریکارڈ کے صفحات ۳۵۱، ۳۵۲ پر موجود ہیں۔ مسٹر اعوان اور ان کے ساتھ ساتھ مسٹر قربان صادق اکرام نے سماعت کرنے والی بینچ سے گواہ پر مزید جرح کی اجازت طلب کی جو نہیں دی گئی۔ شہادتوں کے ریکارڈ میں ایسی کسی درخواست اور اس کے استرداد کے بارے میں کوئی اشارہ موجود نہیں۔ لیکن فردِ احکام میں مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۷۸ء کا حسب ذیل حکم موجود ہے (متفرق احکام کی جلد کے صفحہ ۳۰ پر)

"استغاثے کے گواہ ۱۰۔ کا بیان مکمل ہوا۔ مسٹر ارشاد احمد قریشی کے استغاثے کے گواہ ۱۰۔ مسٹر ذوالفقار علی طور (مجسٹریٹ) سے دو سوالات پوچھنے کے بعد میاں قربان صادق اکرام کھڑے ہوتے اور ان دو سوالات پر اعتراض اٹھائے۔ مسٹر ڈی ایم اعوان نے بھی مسٹر ارشاد احمد قریشی ایڈووکیٹ کے مذکورہ دو سوالات پر اعتراض کیا۔ اس بنا پر کہ یہ سوالات ان کے موکل کے مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے درخواست کی کہ انہیں گواہ پر مزید جرح کرنے کی اجازت دی جائے۔ وکیل کے اعتراضات اور مزید جرح کے لئے مسٹر ڈی ایم اعوان کی درخواست کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ان میں کوئی وزن نہیں"۔

(x) استغاثے کے گواہ ۴۱ عبدالوکیل خان کے بیان کے دوران جب وہ وقوعے سے ۲ یا ۳ دن پہلے ایک بغیر نمبر پلیٹ کی جیپ کو چیک کرنے کا واقعہ بیان کر رہے تھے تو انہوں نے ایف ایس ایف کے اس انسپکٹر کا نام نہیں لیا تھا جن کے کہنے کے مطابق جیپ سے باہر آیا تھا۔ پہلے تو سماعت کرنے والی بینچ نے اپنے طور پر غلام حسین کا نام متعارف کرایا اور قلم بند کیا، جب اس پر اعتراض کیا گیا تو سماعت کرنے والی بینچ نے انسپکٹر کا نام حاصل کرنے کے لئے گواہ سے سوالات کئے۔ سماعت کرنے والی بینچ کے سوال کا شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۳۸۷ پر جواب ذیل میں نقل کیا جاتا ہے،

"انسپکٹر نے اس وقت اپنا نام بتایا تھا جو اب مجھے یاد نہیں۔ اور یہ نام کنٹرول کے توسط سے مسٹر ملہی تک پہنچایا گیا تھا اور انہوں نے تصدیق کی کہ انسپکٹر کا تعلق ایف ایس ایف سے تھا"۔

متفرق احکامات کی جلد کے صفحہ ۱۴۰ پر مورخہ ۹ جنوری ۱۹۷۸ء کے حکم میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ اولاً سماعت کرنے والی بینچ نے "غلطی سے غلام حسین کا نام قلمبند کر لیا تھا اور بعد میں اسے کاٹ دیا گیا تھا۔ مگر شہادت کا ریکارڈ ایسی کوئی تصحیح ظاہر نہیں کرتا۔ اپیل کنندہ کے اس موقف کی تصدیق کرتا ہے کہ شہادت کا ریکارڈ اس کی نقلیں فریقین یا اخبارات کو فراہم کرنے سے پہلے دوبارہ ٹائپ کیا گیا ہے۔ اس میں

قطع و برید کی گئی ہے اور اسے نکھارا گیا ہے۔ اس معاملے میں "بچاؤ" مہم کامیاب نہیں ہوتی۔

(ix) شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۰۴ پر استغاثے کے گواہ۔۱۴۔ نے جرح میں کہا۔

"میں نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت بیان قلم بند کرنے کے لئے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش نہیں کیا۔"

جواب برملا طور پر صفائی کے حق میں گیا اور دکھایا کہ استغاثے نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت اس کا بیان قلم بند کرنے کے لئے ایک اعلیٰ پولیس افسر پر دباؤ ڈالا۔ سماعت کرنے والی بینچ نے فوری مداخلت کی اور حسب ذیل جواب حاصل کیا۔

"عدالت سے: ایف آئی اے نے مجھ سے قلم بند کرانے کو کہا اور میں نے انہیں اطلاع دی کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

عدالت نے اس بچاؤ مہم پر اس لئے عمل کیا کہ جواب کے اس اثر کو زائل کیا جائے جو صفائی کے حق میں گیا تھا۔

(iix) مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۷۸ء کو عبدالوکیل خان (استغاثے کے گواہ ۱۴) نے اپنے بیان میں کہا۔

"تب مسٹر باجوہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ ان خولوں کو دیکھ سکتے ہیں جو موقعے سے برآمد ہوئے۔ اس وقت تک خول مہر بند نہیں ہوئے تھے اور میں نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ خول مہر بند ہو چکے ہیں۔"

فاضل خصوصی وکیل سرکار نے ان سے حسب ذیل سوال کیا۔

"آپ نے انہیں اس معاملے میں ٹالنے کی ضرورت کیوں محسوس کی،"

گواہ نے جواب دیا:

"میرے ذہن میں خیال آیا کہ مسٹر باجوہ خولوں کو دیکھنا چاہتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ ان میں گڑبڑ کرنے کی تجویز پیش کریں۔ مسٹر باجوہ کا ایف ایس ایف سے تعلق تھا اور میں نے انہیں ایف ایس ایف کی گاڑیاں استعمال کرتے دیکھا تھا۔"

گواہ سے یہ جواب دلوایا گیا اور اسے ٹائپ کیا گیا۔ اسی دوران قائم مقام چیف جسٹس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ لکھا اور گواہ کو پڑھ کر سنایا۔ نوٹ کی عبارت یہ تھی۔

"مجھے علم ہے کہ مسٹر باجوہ کا ایف ایس ایف سے بہت گہرا تعلق تھا اور میں ان کی طرف سے ایف ایس ایف کو بری کرنے کی کسی تجویز سے بچنا چاہتا تھا۔"

تب قائم مقام چیف جسٹس نے گواہ سے پوچھا۔

"آپ یہی کہنا چاہتے ہیں؟"

گواہ نے فطری طور پر اثبات میں جواب دیا۔

اس طرح قائم مقام چیف جسٹس کا تحریر کردہ جواب نہ کہ گواہ کا جواب ریکارڈ کا حصہ بنا۔ یہ سوال جواب شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۴۳۸ پر محفوظ ہیں لیکن ریکارڈ یہ ظاہر نہیں کرتا کہ گواہ کا دیا ہوا جواب تحریر کیا گیا تھا اور بعد میں کاٹ دیا گیا اور اس کی جگہ قائم مقام چیف جسٹس کا تحریر کردہ جواب شامل کیا گیا۔

مذکورہ بالا معاملہ سماعت کرنے والی بینچ کے سامنے اپیل کنندہ کی درخواست مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۸ء کے پیراگراف (iix) (۳) ۱۹ میں اٹھایا گیا۔ سماعت کرنے والی بینچ نے حسب ذیل حکم تحریر کیا!



حکم (متفرق احکامات کی جلد کا صفحہ ۱۴۰)

"جہاں تک صفحہ ۴۳۴ پر پیراگراف (iix) (۳) ۱۹ کا تعلق ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ یاد کرنا مشکل ہے کہ اس میں کیا کہا گیا تھا لیکن یہ ایک نمایاں اصول ہے کہ عدالت کا یہ فرض نہیں ہے کہ گواہ کے کہے ہوئے ہر ایک لفظ کو ریکارڈ کرائے۔ یہ صرف اس کے بیان کا اصل مواد ہے جسے ریکارڈ پر لایا جانا چاہیئے۔"

مودبانہ گذارش ہے کہ یہاں عدالت نے تسلیم کیا ہے اس نے نہ صرف شہادت میں گڑبڑ کی ہے بلکہ اس میں اضافہ کیا ہے۔ اسے نکھارا ہے اور اسے استغاثے کے حق میں توڑا مروڑا ہے۔ توڑنے مروڑنے کی اس سے بہتر مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

یہ معزز عدالت خود اس بات کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ گواہ کے بیان کو کیسے گھمایا گیا ہے۔ اپیل کنندہ کے مقدمے کو مضر طور پر متاثر کرنے کے لئے گواہ کے بیان کو کس طرح ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ گواہ نے صرف یہ کہا تھا کہ مسٹر باجوہ کا ایف ایس ایف سے تعلق ہے کیونکہ انہوں نے انہیں ایف ایس ایف کی گاڑیاں استعمال کرتے دیکھا تھا۔ فاضل سماعت کرنے والی بینچ نے یہ بات ریکارڈ پر لاتے ہوئے' بیان کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے گواہ نے جو کچھ کہا تھا اسے یکسر تبدیل کر دیا: "میں جانتا ہوں کہ مسٹر باجوہ کا ایف ایس ایف سے بہت گہرا تعلق تھا۔ اسی طرح گواہ نے ایف ایس ایف کو بری کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

(iiix) استغاثے کے گواہ ۱۶ محمد بشیر نے گواہی دی تھی کہ خولوں کا پارسل مال خانے میں نہیں رکھا گیا اور عدالت میں پیش کردہ دستاویز ای ایچ ۱۱/۱۶ اے پر ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کا اندراج ۱۷ نومبر ۱۹۷۴ء کو کیا گیا تھا۔

شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۴۲۲ پر جرح میں اس سے پوچھا گیا تھا۔

"سوال۔ کیا روزنامچے میں بھی اس اندراج سے مطابقت رکھنے والا کوئی اندراج کیا گیا تھا؟"

روزنامچہ عدالت یا گواہ کے روبرو نہیں تھا لیکن گواہ نے جواب دیا۔

"جی ہاں۔ یہ درست ہے کہ اس اندراج میں یہ کہا گیا ہے کہ روزنامچے کی رپورٹ نمبر ۱۷ پر اس سے مطابقت رکھنے والا اندراج کیا گیا ہے۔ میں نے مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء روزنامچہ دیکھا تھا۔"

اسی جواب نے استغاثے کے اس نظریے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا کہ مال خانے کے رجسٹر میں مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کا اندراج مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۴ء کو کیا گیا تھا کیونکہ روزنامچے میں سابقہ تاریخ کا اندراج نہیں ہو سکتا تھا لیکن سماعت کرنے والی بینچ نے گواہ سے حسب ذیل جواب حاصل کر کے مذکورہ بالا جواب کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی۔

"عدالت سے: رپورٹ میں فرد برآمدگی کے مطابق



مقدمے کی اشیا کا ذکر کیا گیا تھا لیکن خاص طور پر اس پارسل کا نہیں"۔

شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۱۸۰ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس پر خفیہ فنڈ کے رجسٹر کے بارے میں استغاثے کے گواہ۔۲۔ مسعود محمود سے حسب ذیل سوال پوچھا گیا۔

"سوال۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ رجسٹر میں اندراج کرتے ہوتے میاں محمد عباس ان رقموں کے آگے جو آپ وصول کرتے تھے "ڈی۔جی" کے الفاظ کا اضافہ کرتے تھے جس پر آپ ناراض ہوتے تھے"۔

سماعت کرنے والی بینچ نے مذکورہ بالا سوال کو حسب ذیل حکم جاری کر کے مسترد کر دیا۔

"سوال مسترد کیا جاتا ہے کیونکہ گواہ سے اصل دکھائے بغیر رجسٹر کے اندراجات کے بارے میں سوال پوچھا جا رہا ہے"

سماعت کرنے والے بینچ کی طرف سے استغاثے اور صفائی کے لئے دوہرے معیار کا اختیار کرنا نمایاں ہے۔ جب جواب صفائی کے حق میں ہو سکتا تھا سماعت کرنے والی بینچ نے یہ قرار دیا کہ خفیہ فنڈ کے رجسٹر کے اندراجات گواہ سے نہیں پوچھے جا سکتے۔ لیکن استغاثے کے لئے بجائے بہم چلاتے ہوتے سماعت کرنے والی بینچ نے صفائی کے حق میں ایک انتہائی اہم جواب کے اثر کو زائل کرنے کے لئے خود ہی روزنامچے کے اندراجات کے بارے میں سوال کیا جو نہ تو عدالت کے روبرو تھا نہ ہی گواہ کو دکھایا گیا تھا۔

(۷اx) شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۲۴۴ پر سماعت کرنے والی بینچ نے سرکاری وکیل کو استغاثے کے گواہ۔۱۹۔ محمد امیر سے حسب ذیل رہنمائی کرنے والا سوال پوچھنے کی اجازت دی۔

"سوال۔ کیا آپ کو یاد ہے یا نہیں ہے کہ آپ بعد میں صوفی غلام مصطفےٰ انسپکٹر کے ساتھ ڈیوٹی پر گئے تھے یا نہیں گئے تھے۔"

(مسٹر ڈی ایم اعوان اس سوال پر اس بنیاد پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ گواہ کی رہنمائی کرتا ہے۔ اعتراض کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا)

اس سوال کے جواب میں گواہ نے وہ کہانی بیان کی جسے سماعت کرنے والی بینچ نے فیصلے کے پیراگراف ۱۹۸، ۴۰۶، ۴۱۲، اور ۴۹۸ میں قصوری کی کار تلاش کرنے کے لئے دیکھ بھال قرار دیا ہے اور اسے اپیل کنندہ کے خلاف ثبوت فراہم کرنے والی شہادت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

(x۷) شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۴۵۱ پر استغاثے گواہ۔۱۹۔ محمد امیر نے اپنی جیپ کی لاگ بک پیش کی۔ عدالت نے حسب ذیل حکم جاری کیا۔

(نوٹ! اس شئے کو صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے عدالت کے ریکارڈ کا حصہ بنایا ہے کہ یہ اس جیپ میں رکھی جاتی تھی جسے عام طور پر گواہ چلایا کرتا تھا۔ چونکہ وہ بالکل ان پڑھ ہے۔ اس کے اندراجات کو مسلمہ تصور نہیں کیا جائے گا کہ یہ عدالت کے ریکارڈ کا حصہ بن سکے۔ مگر اس سے کسی فریق پر یہ پابندی عائد نہیں ہوگی کہ وہ قانون کے مطابق طلب کردہ اور محولہ گواہوں کے ذریعے اس کے اندراجات کو ثابت کرے)

لاگ بک کے اندراجات ایک سے زیادہ اہم پہلوؤں پر استغاثے کے مقدمے کو ختم کر دیتے ہیں۔ سماعت کرنے والی بینچ نے یہ حکم صادر کر کے کہ اندراجات ریکارڈ کا حصہ نہیں ہوں گے۔ اندراجات کو خارج کر کے استغاثے کو بچانے کے لئے آئی۔ حالانکہ قانون کی رُو سے لاگ بک کے کاروبار کے عام طریقے کے مطابق رکھے جانے کی وجہ سے لاگ بک کے اندراجات ثابت شدہ ہیں۔

(ز۷x) استغاثے کے گواہ۔۴۳ عبدالحیّ نیازی نے عدالت کے رُوبرو جھوٹے اور تاخیر سے دیئے جانے والے بیانات میں کہا کہ جرم سے متعلق خولوں کی برآمدگی کی فرد ۱۱ر نومبر ۱۹۷۴ء کو تیار نہیں کی گئی تھی۔ یہ کہ جرم سے متعلق خول مال خانے میں نہیں رکھے گئے تھے، اور یہ کہ ۱۵ر نومبر ۱۹۷۴ء کو اپنی راولپنڈی سے واپسی پر انہوں نے فرد برآمدگی مرحوم عبدالاحد۔ ڈی ایس پی کے تحریر کردہ مسودے سے نقل کی تھی۔ ان پر میاں قربان صادق اکرام کی جرح میں یہ ثابت ہو گیا کہ برآمدگی فرد برآمدگی کی تیاری اور جرم سے متعلق خولوں کے مال خانے میں جمع کرانے کے بارے میں مطابقت رکھنے والے اندراجات باقاعدہ طور پر کئے گئے تھے۔ میاں قربان صادق اکرام کی جرح کا یہ حصہ ۱۴ر جنوری ۱۹۷۸ء کو مکمل ہوا تھا جب کہ سماعت ۱۵ر جنوری ۱۹۷۸ء کے لئے ملتوی ہوتی تھی۔ عدالتی کارروائی کے بعد ایف آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر عبدالخالق نے ارشاد احمد قریشی کی جرح کے جواب میں بیانات دینے کے لئے گواہ کو سکھایا پڑھایا تھا۔

۱۵ر جنوری ۱۹۷۸ء کو مسٹر قربان صادق اکرام نے گواہ سے بمشکل چند سوالات کئے اور اپنی جرح ختم کر دی۔ اقبالی ملزم کی نمائندگی کرتے ہوتے مسٹر ارشاد احمد قریشی نے، جو تمام عرصے سرکاری وکیل کے شریک کار کا کردار ادا کرتے رہے تھے۔ گواہ پر اپنی جرح میں یہ ظاہر کرنے کے لئے سوالات پوچھے کہ مقدمے کی پہلی تحقیقات کے دوران مقدمے کی ضمنیاں فرضی تھیں اور یہ کہ جب

انہوں نے شفیع الرحمٰن جج کے روبرو تین بار بیانات دیتے تو وہ دباؤ میں تھے۔ اسی بنا پر میاں قربان صادق اکرام نے گواہ پر مزید جرح کے لئے سماعت کرنے والی بینچ سے درخواست کی۔ شہادت کے ریکارڈ کے صفحہ ۶۵۰ پر سماعت کرنے والی بینچ نے نوٹ کی صورت میں



حسب ذیل حکم صادر کیا۔

"(نوٹ: مسٹر قربان صادق اکرام جرح کے طور گواہ سے ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ مسٹر ارشاد احمد قریشی نے اپنی جرح سے مسٹر قربان صادق اکرام کے موکل کے مقدمے کو نقصان پہنچایا ہے۔ سوال کو تحریر کر لیا جائے تاکہ ہم اس نکتے پر فیصلہ دینے کے قابل ہو سکیں")

اس کے بعد میاں قربان صادق اکرام نے گواہ سے حسب ذیل سوال پوچھا!

سوال: کیا یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ روز عدالت کی کارروائی کے بعد مسٹر عبدالخالق۔ ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے نے آپ کو سمجھایا تھا کہ مسٹر ارشاد احمد قریشی کی طرف سے پوچھے جانے والے سوال کے جواب میں عدالت میں وہ بیان دیں جو آپ نے دیا ہے؟

سماعت کرنے والی بینچ نے حسب ذیل حکم کے ذریعے اس سوال کی اجازت نہیں دی۔

حکم: یہ سوال آسانی سے اس وقت پوچھا جا سکتا تھا جس وقت آج صبح مسٹر قربان صادق اکرام گواہ پر جرح کر رہے تھے۔ کیونکہ جیسا کہ سوال سے ظاہر ہوتا ہے الزام یہ ہے کہ گزشتہ روز ایف آئی اے کے ایک افسر نے گواہ کو سمجھایا بجھایا تھا۔ اس لئے سوال مسترد کیا جاتا ہے۔

سماعت کرنے والی بینچ نے "بجائے مہم" کا استعمال اس لئے کیا ہے کہ اس بات کا انتظام کرے کہ مسٹر ارشاد احمد قریشی کی گواہ پر جرح کے ذریعے جو بیانات ریکارڈ پر لائے گئے ہیں انہیں معرض بحث میں نہ لایا جائے۔ سوال کی اجازت نہ دینے کے جو اسباب سماعت کرنے والی بینچ نے دیتے ہیں۔ وزن سے خالی ہیں۔ کیونکہ محولہ بالا سوال گواہ سے اس وقت تک نہیں پوچھا جا سکتا تھا جب تک کہ ایف آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی ہدایات پر عمل درآمد ہو جاتے اور گواہ ممنون کرنے والے بیانات نہ دے چکے۔

(۵۴) استغاثے کا مقدمہ جھوٹا، من گھڑت اور سیاسی اغراض کے تحت ہے تاکہ مارشل لا حکومت کے ملک پر اپنی حکومت اور اقتدار کو جاری رکھنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، اپیل کنندہ کو ختم کر دیا جائے۔

(۵۵) مقدمے کی کارروائی بھی بے اثر ہو گئی ہے کیونکہ قانون کی متعلقہ دفعات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کئی گواہوں کی شہادتیں اپیل کنندہ کی غیر موجودگی میں قلمبند کی گئی ہیں۔ ایک موقعے پر تو اپیل کنندہ کو عدالت سے باہر نکال دیا گیا اور استغاثے کے گواہوں کی شہادت کی قلم بندی جاری رہی۔

(۵۶) کہ کچھ شہادتیں جنہیں سماعت کرنے والی بینچ نے فیصلے میں ملوث کرنے والی تصور کیا ہے۔ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۴۲ کے تحت اپیل کنندہ کے بیان کے وقت سامنے نہیں لائی گئیں۔ یہ صورت حال فیصلے کو بے اثر کرتی ہے۔

(۵۷) کہ قائم مقام چیف جسٹس جو سماعت کرنے والی بینچ کی صدارت کر رہے تھے نے مقدمے کی کارروائی کے دوران اپیل کنندہ کی ایک شکایت کی بنا پر اور دوسرے موقعے پر ایک تحقیقاتی افسر کا کردار اختیار کر لیا۔

(۵۸) استغاثے کے گواہ ۲۔ مسعود محمود اور استغاثے کے گواہ ۳۔ غلام حسین کے اعترافات کے پیش نظر یہ بات واضح ہے کہ مقدمے کے دو سلطانی گواہوں نے قانون کے تقاضوں کے مطابق اپنی معافی کی شرائط کی تکمیل نہیں کی ہے۔ سلطانی گواہوں کی حیثیت سے ان کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی۔

(۵۹) سارا مقدمہ، ساری کارروائیاں، مقدمے کی کارروائی کے دوران صادر کئے جانے والے احکام اور فیصلہ غیر قانونی، نامنصفانہ ہیں۔ حقائق اور قانون کی رو سے برقرار نہیں رہ سکتے۔ اور اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں کالعدم قرار دیا جائے۔

لاہور۔ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۷۸ء

تحریر کردہ — دائر کردہ

(ڈی ایم اعوان) — (نور احمد نوری)

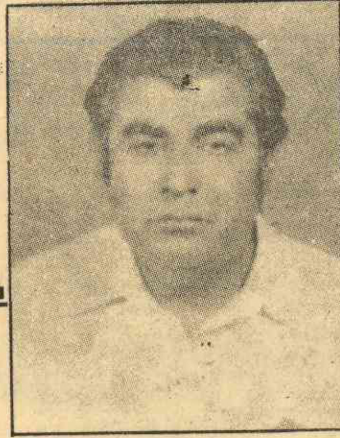
ایڈووکیٹ سپریم کورٹ — ایڈووکیٹ آن ریکارڈ

طے کردہ

(یحییٰ بختیار)

سینئر ایڈووکیٹ

سپریم کورٹ



رحیم بخش جتوئی
سے
انٹرویو

صحافی ناصر زیدی نے مسکراتے ہوئے کوڑے کھائے

جیل میں ایک دس گیارہ سال کے بچے کو دس کوڑے لگے اور پانچ فرمائشی لگائے گئے

قسور سعید مرزا

تحریکِ آزادئ صحافت کے اسیر جناب رحیم بخش جتوئی (امروز ملتان)، کو گزشتہ روز ساہیوال جیل سے رہا کر دیا گیا۔ رہا ہونے کے فوراً بعد رحیم بخش جتوئی ملتان پہنچ گئے وہ گزشتہ پانچ چھ سال سے اخباری دنیا سے منسلک ہیں۔ مزدور اور کسان تحریکوں میں بھرپور حصہ لے چکے ہیں۔ متعدد بار جیل کی سیر کر چکے ہیں۔ پی پی ایل یونین کے سرگرم کارکن ہیں موجودہ تحریکِ آزادئ صحافت میں حصہ لینے کی وجہ سے ملازمت سے نکالے جا چکے ہیں۔ انہوں نے انٹرویو میں صحافیوں کی حالیہ تحریک کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

مرزا۔ جتوئی صاحب! آپ کی گرفتاری اور سزا کس طرح عمل میں آئی؟

جتوئی۔ ۳۰ اپریل کو پی ایف یو جے کے سیکرٹری جنرل جناب نثار عثمانی اور ایپنک کے جنرل سیکرٹری جناب حفیظ راقب کے ہمراہ مجھے گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری کے بعد ہمیں سول لائن تھانہ لاہور کے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ اگلی صبح ۱۵ یوم کا ریمانڈ لیا گیا اور ۷ مئی کو ہمیں قید بامشقت اور جرمانوں کی سزا سنا دی گئی۔

مرزا۔ فوجی حکومت سے سزا پانے کے بعد آپ کے فوری کیا تاثرات تھے؟

جتوئی۔ پاکستان ایک پسماندہ ملک ہے۔ پاکستان مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کا ملک ہے۔ پاکستان کے غریب عوام اور محنت کش لوگوں کی آزادی میں ہمارا ابھی کچھ حصہ شامل ہے۔ اس سزا پہ ہم فخر محسوس کرتے تھے۔

مرزا۔ قید کے دوران آپ سے کیا مشقت لی جاتی تھی اور حکام کا رویہ کیسا تھا؟

جتوئی۔ ہمیں جیل میں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہمارے حوصلے بلند ہونے کی وجہ سے ایسی مشکلات ہمیں پریشان نہ کر سکیں۔ جیل میں ہم اُون کے دھاگے بنتے تھے۔ بان کوٹتے تھے۔ دریاں بنتے تھے۔ اور سوت کے دھاگے بناتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر عدالتوں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ رویہ انتہائی ہتک آمیز تھا۔ جیل کے اندر قیدیوں نے بے پناہ عقیدت اور خلوص کا اظہار کیا اور نہایت احترام کے ساتھ پیش آئے۔

مرزا۔ آزادئ صحافت کی تحریک کو سیاسی تحریک کہا جا رہا ہے کیا یہ درست ہے؟

جتوئی۔ آزادئ صحافت کی موجودہ تحریک قطعی سیاسی تحریک نہیں ہے۔ بلکہ ٹریڈ یونین تحریک ہے۔ البتہ جن لوگوں پر سیاست کی پابندی ہے وہ کھلم کھلا حصہ لے کر عوام کے سیاسی اور جمہوری حقوق غصب کر رہے ہیں۔

حکومت سے مذاکرات کا حق صرف اور صرف برنا کو ہے

ان کا وزن کم تھا، دل کے مریض ہیں اور نبض بھی ٹھیک کام نہیں کرتی

مرزا۔ عبوری دور کے منسٹر شیخ رفیق احمد نے کہا ہے کہ صحافی ۱۵ ہزار روپے لے کر احتجاج کر رہے ہیں۔ کیا کسی صحافی نے ۱۵ ہزار روپے لیے ہیں؟

جتوئی۔ یہ بیان اور الزام انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے ہم مشورہ دیتے ہیں کہ موصوف کو دماغی علاج کے لیے کسی ملک میں بھیجا جائے۔ صحافیوں نے ہر دور میں آزادئ صحافت کے لیے جنگ لڑی ہے۔ خواہ یہ دور ایوب خان کا ہو۔ یا یحییٰ خاں اور بھٹو کا ہو۔ ملک کے باشعور صحافی اپنا یہ کردار ادا کرتا رہے گا۔

مرزا۔ کیا واقعی کوٹ لکھپت جیل میں صحافیوں نے مسٹر بھٹو کی کوٹھڑی کے قریب شور و غل مچایا تھا۔ اور مسٹر بھٹو کی شکایت پر صحافیوں کو دیگر جیلوں میں بھیجا گیا۔

جتوئی۔ یہ سراسر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحافیوں کو قید کی سزا دینے کے بعد حکام مزید اذیت دینا چاہتے تھے۔ صحافیوں کو مختلف گروپوں میں تقسیم کرکے میانوالی، ساہیوال، فیصل آباد، ملتان، بہاولپور منتقل کر دیا گیا۔ یہ بھی اذیت کا ایک طریقہ تھا۔ چنانچہ ۱۳ مئی کو دیگر ساتھیوں کے ہمراہ مجھے ساہیوال جیل منتقل کر دیا گیا۔

مرزا۔ "الفتح" کے ضلعی نمائندے اور لوائے ملتان سے منسلک ناصر زیدی کو دیگر سزاؤں کے علاوہ کوڑوں کی سزا بھی ملی۔ اس سزا پر ناصر زیدی کے کیا تاثرات تھے۔

جتوئی۔ بقول حسین نقی ناصر زیدی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا ہے۔ ملتان کا یہ نوجوان اپنے نظریات میں کندن بن چکا ہے۔ جیل میں جسمانی طور پر کمزور اس نوجوان کا حوصلہ بلند اور عزائم پختہ تھے۔ ناصر زیدی کا قول ہے کہ ہم اپنے حقوق کے حصول کے لیے اس سے بھی زیادہ اذیت برداشت کر سکتے ہیں۔ ناصر زیدی کا وزن کم تھا۔ دل کا مریض بھی ہے اور نبض بھی ٹھیک کام نہیں کرتی۔ اور یہ حقائق جیل ڈاکٹر کے نوٹس میں نہیں لائے گئے۔ ناصر زیدی نے مسکراتے ہوئے کوڑے کھائے۔ اور کہا "کوڑے ہمارے حوصلے کی بلندی یا ولولہ کو متزلزل نہ کر سکیں گے"۔

اسی طرح خاور نعیم ہاشمی (مساوات لاہور) بھی جسمانی طور پر کمزور اور نحیف تھے۔

مرزا: بعض صحافیوں اور حکومت کے درمیان طے پانے والے معاہدہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جتوئی۔ میں حکومت اور چار غداروں کے ٹولے میں طے پانے والے ذلت آمیز معاہدے کو مکمل طور پر رد کرتا ہوں۔ یہ مذاکرات یک طرفہ تھے۔ حکومت نے اپنے نامزد آدمیوں سے مذاکرات کیے۔ آزادئ صحافت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ تمام صحافیوں کو فوری طور پر رہا کیا جائے۔ الفتح، معیار، پیام، قائد اور دوسرے جریدے غیر مشروط طور پر بحال کیے جائیں۔ نیشنل ٹرسٹ کے برطرف شدہ صحافیوں کو بحال کیا جائے۔ ۸ نکات جو کہ ۸ مطالبات ہیں پورے کیے جائیں۔ حکومت سے مذاکرات کا حق صرف اور صرف جناب منہاج برنا کو حاصل ہے۔ اگر صحافیوں کے مطالبات کو پورا نہ کیا گیا تو صحافی اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں گے۔ اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دیں گے۔

مرزا۔ ۳۱ دن کی اسیری کا کوئی اہم واقعہ۔

جتوئی۔ چیچہ وطنی کے قریب ریلوے پٹڑیاں اکھاڑنے کے الزام میں کئی افراد گرفتار ہیں۔ ان گرفتار شدگان میں ایک ملزم کی عمر دس گیارہ سال کے قریب ہے۔ اس ملزم کو دس کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ دس کوڑے کھانے کے بعد اس نوعمر لڑکے نے کہا کہ "جناب بھٹو کے نام پر مزید پانچ کوڑے لگائے جائیں"۔ اس نوعمر لڑکے کی فرمائش پوری کرتے ہوئے پانچ کوڑے مزید لگائے گئے۔



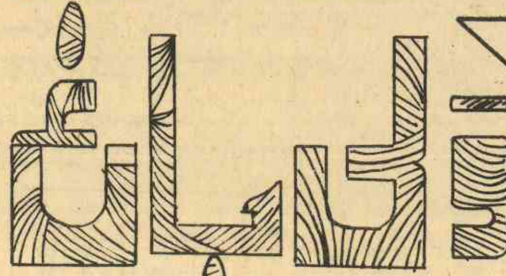
ساہیوال

طارق منیر

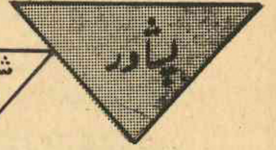
شاکر اور بابر کو رہا کیا جائے

نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن پاکستان ضلع ساہیوال کے صدر سید احتشام اکبر جنرل سیکرٹری قسور بٹ اور این ایس ایف پاکستان کے مرکزی سیکرٹری نشر و اشاعت وقاص بٹ نے ایک مشترکہ بیان این ایس ایف پاکستان کے مرکزی صدر حبیب اللہ شاکر اور ورکرز آرگنائزنگ کمیٹی پاکستان کے مرکزی چیئرمین محمود نواز بابر کی فی الفور رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ مزدور لیڈر محمود نواز بابر کی مسلسل نظر بندی کی وجہ سے مزدوروں اور عوام میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے انہوں نے کہا کہ محمود نواز بابر کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے سرکاری پریس نوٹ کو غلط قرار دے کر سانحہ ملتان کے شہید مزدوروں کی اصل تعداد سے پردہ چاک کیا تھا جو حکومت کو ناگوار گزرا اور محمود نواز بابر اسی پاداش میں آج تک جیل میں نظر بند ہیں اور جیل میں ان پر تشدد کیا جا رہا ہے انہوں نے کہا کہ ترقی پسند قوتوں کو استحصالی طبقات کے خلاف اپنی جدوجہد کو تیز کر دینا چاہیے ظلم و تشدد اور جیلیں ہمارے راستے میں حائل نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ جیلیں تو عوامی جمہوری انقلاب کی اصل درسگاہیں ہیں انہوں نے کہا کہ ظلم و تشدد افراتفری اور بے چینی انقلاب کو جنم دیتی ہے اور یہی بات پاکستان کے ظالم سرمایہ دار، جاگیردار طبقات کی تباہی کا باعث ہو گی اور پھر ظلم و تشدد کی چکی میں پسے ہوئے مظلوم عوام کو آزادی نصیب ہو گی۔ لہٰذا تمام ترقی پسند تنظیموں اور لیڈروں کو اپنی جدوجہد کو تیز سے تیز کر دینا چاہیے تاکہ غریب عوام مہنگائی بے روزگاری اور موجودہ طبقاتی نظام سے جلد از جلد چھٹکارہ حاصل کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ محمود نواز بابر اور عزیز الحسن جیسے مزدور دوست مخلص رہنما جیلوں میں بند ہیں لیکن نام نہاد مزدور لیڈر اپنی موقعہ پرستی کی وجہ سے کھلے دندناتے پھر رہے ہیں اور وہ جیلوں میں بند مزدور لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ تک نہیں کرتے انہوں نے مطالبہ کیا کہ سانحہ ملتان کی تحقیقات از سر نو ہائیکورٹ کے ججوں سے کرائی جائے، اور تحقیقاتی کمیٹی میں مزدور لیڈر بھی شامل کیے جائیں حبیب اللہ شاکر، محمود نواز بابر، عزیز الحسن اور محمد علی قادری سمیت تمام گرفتار شدہ مزدوروں، صحافیوں اور طالب علموں کو رہا کیا جائے صحافیوں کے مطالبات تسلیم کیے جائیں اور پی ایف یو جے اور ایپنک کے با اختیار اور حقیقی لیڈروں سے مذاکرات کیے جائیں منہاج برنا کے صوبہ بدری اور زبان بندی کے احکامات منسوخ کیے جائیں۔ مہنگائی اور بے روزگاری کا خاتمہ کیا جائے۔ مہنگائی کی مناسبت سے اجرتوں میں اضافہ کیا جائے اور روزگار کا تحفظ دیا جائے۔ بنیادی جمہوری حقوق بحال کیے جائیں اور جمہوری عمل کے لیے سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھائی جائے، ہفت روزہ الفتح اور روزنامہ مساوات کراچی کی اشاعت بحال کی جائے۔

ولی خاں



میں ہار گئے



۱۷ لاکھ روپے کی ڈکیتی کی سزا سات سال، ۴ لاکھ کے ڈاکے کی سزا قطع ید

ایک زمانہ تھا جب سرحد کے تمام تعلیمی اداروں میں نیپ کی ذیلی تنظیم پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا طوطی بولا کرتا تھا لیکن اس وقت نیپ اپنے مقاصد میں صداقت اور اپنی جدوجہد میں راست تھی۔ نظری یقین سے قطع نظر پختون عوام اس جماعت کے اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہ کرنے کے سبب اس کا ساتھ دیتے تھے۔ جمہوری زاویوں میں ووٹ رفتار پیما کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ نیپ کی سطح پر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کُلّی طور پر تو نہیں لیکن ایک حد تک سرحد کے عوام نے اس جماعت پر اعتماد کا اظہار کیا، اسی نسبت سے تعلیمی اداروں میں پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے صعوبتوں کے عذاب سہنے کے باوجود ہر ہر قدم پر طلبا سے اعتماد وصول کیا۔ اور بظاہر یوں لگتا تھا جیسے نیپ کی حکمت عملی کے سوا یہاں کوئی دوسرا قدم نہیں رکھ سکے گا۔ لیکن آج پورے سرحد میں پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے نہ صرف اپنی سابقہ مقبولیت کو کھو دیا ہے بلکہ اب پورے سرحد میں پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد گمنامی میں جاتی دکھائی دے رہی ہے۔

پشاور یونیورسٹی میں کفر و اسلام کی جنگ لڑنے والی جماعت اسلامی کو بُری طرح شکست دینے کے بعد پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں جیت گئی۔ نہ صرف یونیورسٹی بلکہ اب تک کی اطلاعات کے مطابق گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسمٰعیل خان، میران شاہ، بنوں، لکی مروت، ٹانک، پاڑہ چنار، تنگی، نوشہرہ کے کالجوں کے ساتھ بیگم نسیم ولی کے حلقۂ نیابت مردان اور ولی خان کی راجدھانی چارسدہ کے گورنمنٹ کالجوں میں بھی پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن اپنے حریف طلبا تنظیموں کو شکست دے کر پورے پینل کے ساتھ کامیاب ہو چکی ہے۔ اس کا عبرتناک پہلو یہ ہے کہ ستر سال سے سُرخ پوشوں کے گڑھ اتمان زئی چارسدہ میں پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی کامیابی نہ صرف طلبا کی کامیابی ہے بلکہ گڑھ کے ٹوٹنے بکھرنے کی ایک نئی روایت دکھائی دے رہی ہے۔ وقت بڑا بے رحم ہوتا ہے کبھی چارسدہ میں اس بات کا تصوّر ممکن نہیں تھا کہ یہاں نیپ کی زیر لب مخالفت بھی کی جا سکے گی۔ اور کجا پیپلز پارٹی کی ذیلی تنظیم پیپلز سٹوڈنٹ فیڈریشن نے اس قلعہ میں نہ صرف شگاف ڈالا ہے، بلکہ اس کی پرانی روایت کو بھی ڈھانے میں موثر کردار ادا کیا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے پورے سرحد میں کامیابی حاصل کر کے سرحد کے سیاسی رجحانات کی بڑھتی واضح نشاندہی کر دی ہے اور یوں اس بات کا اظہار غیر مبہم ہو گیا ہے کہ سرحد کے عوام موجودہ صورتحال سے مطمئن نہیں۔ اور جب بھی انہیں اپنے جمہوری حق یعنی ووٹ کے استعمال کا حق دیا گیا، وہ اپنا فیصلہ موجودہ حکومت کی خواہش کے مطابق نہیں دیں گے۔ اور یوں یہ بات صادق آتی ہے کہ ؎

جتنے گھنے ہوں گے اندھیارے چاند ستارے چمکیں گے

گزشتہ ہفتہ کی شام پشاور یونیورسٹی کے نئے عہدیداروں کی رسم حلف وفاداری انجام پائی۔ حلف وفاداری کے لئے یونیورسٹی یونین نے پاکستان سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس یعقوب علی خان کو دعوت دی جناب یعقوب علی نے یہ دعوت قبول کر لی۔ جب سرحد کی انتظامیہ کو معلوم ہوا تو جناب یعقوب علی کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ جناب یعقوب پر پابندی کے بعد یونین نے سرحد کے سابق گورنر میجر جنرل ریٹائرڈ نصیر اللہ بابر کو دعوت دی۔ یہاں تک کہ کارڈ بھی چھپ گئے۔ لیکن سرحد کی انتظامیہ نے ان کی شمولیت پر بھی پابندی لگا دی۔ چنانچہ یونین کے کارپردازوں نے فوری فیصلہ کیا اور یونیورسٹی درجہ چہارم کے ملازمین کی یونین کے صدر عبدالستار خان جو خود کیفے ٹیریا کے ملازم ہیں کو مہمان خصوصی بنایا گیا۔ اور یوں رسم حلفِ وفاداری کی تقریب کا آغاز ہوا۔

حلف سے قبل ہال پوری طرح طلبا سے بھر چکا تھا دس ہزار سے زائد طلبا کا یہ اجتماع پُرجوش نعروں سے پوری یونیورسٹی کو لرزا رہا تھا۔ اسی اثنا میں پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو کی قدِ آدم تصویر سٹیج پر لائی گئی۔ یوں لگا جیسے مسٹر بھٹو خود ہال میں آ گئے ہوں۔ ہال تالیوں اور نعروں سے گونج اُٹھا اور یہ سلسلہ نصف گھنٹے تک جاری رہا۔ حلف یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے لیا اور آخر میں مہمانِ خصوصی عبدالستار خان نے طلبا یونین کو ملازمین کی طرف سے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

مسٹر حمید اللہ زاہد پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن سرحد کے سابق صدر جب ایک سال کی قید کاٹ کر ہری پور جیل سے رہا ہونے کے بعد پشاور پہنچے تو ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ طلبا نے جلوس کی شکل میں مسٹر زاہد کو دفتر تک پہنچایا اور مختلف قسم کے پُرجوش نعرے لگائے۔

ملک کے ممتاز شاعر حبیب جالب کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر پشاور کے ادیبوں نے بھی حبیب جالب کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے ایک اجلاس منعقد کیا۔ جمعرات

کی شام کو گرین ہوٹل میں ہونے والے اس اجلاس کی صدارت ممتاز ترقی پسند شاعر فارغ بخاری نے کی۔ خاطر غزنوی محسن احسان اور ایوب صابر نے ہدیۂ عقیدت پیش کیا، حبیب جالب نے کہا کہ برسوں سے ہم کارکن بڑی بڑی کوٹھیوں اور لمبی لمبی کاروں والوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں ہر موقعہ پر یہ قیادت ہمیں دھوکا دیتی ہے اور ہر دھوکے کے بعد ہم دوبارہ ان ہی جیسا کوئی لیڈر تلاش کر لیتے ہیں انہوں نے بڑے پتے کی بات کی، کہ جب تک ہم اپنے طبقے اور کارکنوں میں سے قیادت نہیں پیدا کریں گے، اس وقت تک ہم اپنے طبقوں کے مفادات کی صحیح طور پر نگرانی نہیں کر سکتے۔ جب کہ یہ طبقہ بہتر قیادت مہیا کر سکتا ہے اور بھرپور قائدانہ صلاحیتوں کے مالک کارکن ہم میں موجود ہیں'

ٹرائبل اسٹوڈنٹس فیڈریشن قبائلی طلبا کی واحد نمائندہ تنظیم ہے۔ ترقی پسند نظریات رکھنے کے سبب اکثر و بیشتر قومی اور قبائلی مسائل پر بھی بحث کرتی ہے۔ ایک اخباری بیان میں اس نے مارشل لا حکومت کی طرف سے ڈکیتی مقدمے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دینے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کراچی میں خصوصی فوجی عدالت نے تین ملزموں کو جنہوں نے ۱۰ ستمبر ۱۹۷۷ء کو یونائیٹڈ بنک سے ۳ لاکھ ۶۱ ہزار روپے لوٹے تھے کو ہاتھ کاٹنے کی سزا سنائی گئی۔ اس کے برعکس ۱۹ ستمبر ۱۹۷۷ء کو پانچ ملزموں نے فیصل آباد کے چینوٹ بازار میں مسلم کمرشل بنک کی شاخ میں مسلح ڈاکہ ڈالا تھا اور ۱۷ لاکھ روپے لوٹ کر فرار ہو گئے تھے پولیس نے ان پانچ ملزموں کو گرفتار کر کے ان کے قبضہ سے مسروقہ مال برآمد کیا تھا۔ ان پانچ ملزموں کو عدالت نے صرف سات سال قید سخت کی سزا دی ہے۔ یہ خبر ۳۰ مئی کے جنگ کراچی میں شائع ہوئی اور روزنامہ جسارت نے یکم جون کو اس پر تبصرہ شائع کیا تھا۔ ایسی حالت میں جب کہ دونوں ایک ہی نوعیت کے کیس ہیں۔ کراچی کے ملزموں کی سزا سراسر ظلم اور ناانصافی کے مترادف ہوگی۔ اور اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ قبائلی عوام کو مغلوب کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹنے کی سزا پانے والے ملزم قبائلی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کو قطع ید کی سزا مل رہی ہے۔ اسی قسم کی سزا سے جو صرف قبائلیوں کو ملتی ہے۔ قبائلی عوام میں ضرور بے چینی پھیلے گی۔ ایسی حالت میں جب کہ افغان حکومت اور پاکستان کی حکومت کی پالیسیوں میں مکمل تضاد ہے۔ اور افغان حکومت قبائلیوں میں خاص دلچسپی لے رہی ہے۔ قبائلیوں میں اس قسم کی بے چینی ملک و قوم کے لئے باعث خطرہ ہو سکتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ قبائلی عوام نے پاکستان کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔ قبائلی عوام نے ہر حالت میں اور ہر میدان میں پاکستان کے وفادار ہونے کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ قبائلی عوام پاکستان میں اسلامی نظام کو خوش آمدید کہیں گے کیونکہ قبائلی عوام میں اسلام کا کافی جذبہ موجود ہے اور وہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں۔ لیکن جب تک ملک میں اسلامی معاشرہ قائم نہ ہو اُس وقت تک اسلامی سزائیں اور وہ بھی صرف قبائلیوں کے لئے یقیناً بے چینی کا سبب بنیں گی اور ہم نہیں چاہتے کہ حکومت پاکستان اور قبائلی عوام کے درمیان کوئی ایسی غلط فہمی پیدا ہو جس سے ملک و قوم کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہو۔ لہٰذا ہم مارشل لا انتظامیہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ تجربہ قبائلی عوام پر نہ کیا جائے اور اُن تین ملزموں کو معاف کر دیں یا قبائلی جرگہ کے حوالے کر دیں۔

بہاولپور

محبوب علی رانا

ڈسپنسرز جائز حقوق سے بھی محروم کر دیئے گئے

پاکستان قائم ہوئے تیس برس گزر چکے ہیں لیکن کسی بھی حکومت نے ڈسپنسروں اور پیرا میڈیکل سٹاف کے مسائل کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ ان کے جائز مطالبات جائز حقوق کو نظر انداز ہی کرتے رہے اور حکام بالا اس طبقہ کو مزید مسائل میں اُلجھاتے رہے حتیٰ کہ غربت، افلاس رنج و غم اور ناانصافیاں ڈسپنسروں اور پیرا میڈیکل سٹاف کا مقدر بنتی ہی گئیں اور آج بھی بے چارے ڈسپنسرز مسائل کے بھنور میں گردش کر رہے ہیں حالانکہ ڈسپنسرز اور پیرا میڈیکل سٹاف جو تھکے ماندے دم توڑتے ہوئے بیمار انسانوں کی تیمارداری کر کے انسانیت کا اعلیٰ ترین فریضہ انجام دیتے ہیں اور چوبیس گھنٹے عوام کی خدمت کرنا اپنی زندگی کا اعلیٰ مشن سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود ڈسپنسروں کو پانچواں سکیل دیا جاتا ہے جبکہ ان کی ترقی کی راہیں بھی مسدود ہو کر رہ گئی ہیں

مہنگائی کا دور دورہ ہے اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ اس کٹھن ابتلا و آزمائش اور بے بسی کے عالم میں یہ ڈسپنسرز بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ تنخواہ بہت قلیل ہے جبکہ سادہ زندگی گزارنے کے لیے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ تو کیا آپ ہی بتائیں یہ ڈسپنسروں کے ساتھ ظلم و جبر کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے؟

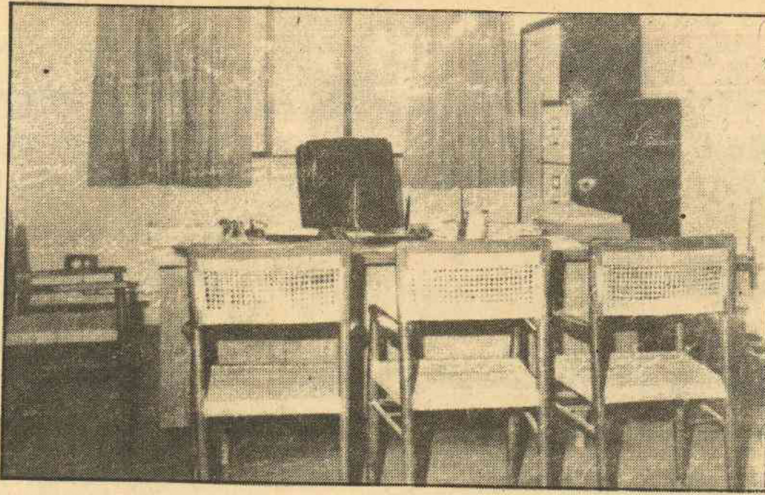
ٹیچرز اور پروفیسر صاحبان تدریسی و دیگر الاؤنس لے رہے ہیں ڈاکٹر صاحبان بھی نان پریکٹس و دیگر الاؤنس حاصل کر رہے ہیں لیکن ڈسپنسرز اپنے ان جائز حقوق سے بھی محروم ہیں اور اپنی زندگی بڑی کسمپرسی کی حالت میں بسر کر رہے ہیں۔

ڈسپنسرز کا پیشہ بہت معزز پیشہ ہے صبح ہو یا شام دن ہو یا رات، سردی ہو یا گرمی ڈسپنسرز ملک کے بیمار انسانوں کی خدمت میں مشغول ہی رہتے ہیں۔ ایک کلرک ترقی کر کے کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے لیکن پیرا میڈیکل سٹاف اور ڈسپنسرز اپنی اُسی پوسٹ پر تعینات رہتے ہیں جہاں سے اُنہوں نے روزگار کا آغاز کیا تھا۔ ایک وقت تھا کہ جب میٹرک پاس ڈسپنسرز کے لیے ایل ایم ایس ایف کا کورس ہوا کرتا تھا بنیادی مقصد پیرا میڈیکل کے سٹاف اور ڈسپنسروں کے لیے ترقی کے مواقع فراہم کرنا تھا لیکن یہ کورس بھی بند کر دیا گیا جس سے پیرا میڈیکل سٹاف اور ڈسپنسروں کے ترقی کے امکانات ختم ہو گئے

مردانہ وارڈ میں میل نرس ہونے چاہیئں اور اس کورس میں ڈسپنسروں کو نرسنگ کنڈنس کا داخلہ دیا جائے تاکہ ہمارے ملک میں میل نرس کی کمی کو دور کیا جا سکے۔ اور یہ کیا خوب ہوگا کہ آئندہ کے لیے ڈسپنسرز کلاس پر پابندی لگا کر میل نرس کورس کا تمام میڈیکل کالجوں میں اجراء کیا جائے تاکہ میل نرس ڈسپنسروں کا کام بھی انجام دے سکیں اور اس میں داخلے کے لیے تمام کوالیفائڈ ڈسپنسروں کو ترجیحی بنیادوں پر داخلہ دیا جائے اور یہ کنڈنس کورس صرف ڈسپنسروں کے لیے ہو۔ اسی طرح ایل ایس۔ ایم ایف کی کلاس کا بھی اجراء کیا جائے اور اس میں ترجیحی بنیادوں پر کوالیفائڈ ڈسپنسروں کو داخلہ دیا جائے تاکہ مستقبل میں ڈسپنسرز بھی ایک ڈاکٹر بن کر دیہی علاقوں اور شہروں میں اپنی بیمار عوام کے لیے مسیحا بن سکیں۔ اور مصائب و آلام کی دنیا سے نجات پا کر آرام و سکون کی زندگی گذار سکیں کیونکہ جب قوم کے مسیحا ہی سوچ و اضطرابیت جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہوں تو وہ عوام کے درد کا ازالہ کس طرح سے کر سکتے ہیں

جامعہ کراچی

توصیف احمد



چندہ کی اپیل اور کلیہ فارمیسی کے سربراہ کے دفتر کی سجاوٹ پر ۲۶ ہزار روپے کا خرچ

ایک سو دس روپے والا پلنگ ۱۹۰ اور چار سو روپے والا پنکھا ۴۵۰ میں خریدا گیا

جامعہ کراچی تین سال قبل پونے دو کروڑ روپے کے خسارے کا شکار تھی اب یہ خسارہ ڈھائی کروڑ روپے سے زیادہ کا ہو گیا ہے اور ہر سال اس خسارے میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اسی مالی خسارے کی بنا پر پچھلے دو سال سے جامعہ کراچی میں کوئی سائنسی تحقیقات کا کام مکمل نہیں ہوا ہے۔ تین سال سے جامعہ کراچی کی انتظامیہ اور طلبا یونین جامعہ کے خسارے اور گرانٹ میں اضافے کا مسلسل مطالبہ کرتی رہی ہیں۔

اس مالیاتی بحران کی وجہ سے جامعہ کے تمام ترقیاتی اور تحقیقاتی کام بند پڑے ہیں۔ جامعہ کے بہت سے شعبوں کی فنڈز مہیا نہ ہونے کی وجہ سے انتہائی ابتر حالت ہے۔ کئی شعبوں میں فرنیچر کی شدید کمی ہے پرانا فرنیچر ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ نئے فرنیچر خریدنے کے لئے فنڈز نہیں ہے۔ مختلف سیمناروں میں طلبا و طالبات کی تعداد کے لحاظ سے نشستیں انتہائی کم ہیں جامعہ کی پانچوں کلیات میں اساتذہ کا تناسب طلبا و طالبات کی تعداد کے تناسب سے بہت کم ہے۔ نئے اساتذہ کا تقرر نہیں کیا جا رہا۔ چند شعبوں میں اساتذہ کی کمی کو وقتی طور پر پورا کرنے کے لئے جز وقتی اساتذہ کا تقرر کیا جاتا ہے۔ ان اساتذہ کو بھی بے شمار مسائل درپیش آتے ہیں۔ ایک تو ان اساتذہ کو معاوضہ انتہائی کم دیا جاتا ہے پھر ان کے بل سالوں شعبۂ حسابات میں پڑے رہتے ہیں۔

مالیاتی خسارے کی وجہ سے لائبریری کی کارکردگی شدید متاثر ہو رہی ہے۔ ایک تو طلبا و طالبات کی تعداد میں اضافہ کے باوجود لائبریری کی نشستوں میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ اس وقت کل طلبا و طالبات کی تعداد سے نصف سے بھی کم نشستیں لائبریری میں موجود ہیں۔ فنڈ میں اضافہ نہ ہونے کی بنا پر لائبریری کے لئے نئی کتابیں کئی سالوں سے نہیں خریدی گئیں۔ طلبا کتابوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں مگر کتابیں ہوں تو ملیں۔ لائبریری میں پہلے ہر سال مختلف یورپی ممالک کے سائنسی جرنل آتے تھے۔ جو مختلف سائنسی پروجیکٹوں میں انتہائی مفید ثابت ہوتے تھے مگر پچھلے تین سال سے جرنل کی خریداری التوا میں پڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے سائنس کے تحقیقاتی کام شدید متاثر ہوتے ہیں۔ سائنس اور فارمیسی فیکلٹی کی سائنسی تجربہ گاہوں میں عرصے سے نیا سامان فراہم نہیں کیا گیا ہے۔ سائنسی آلات اور کیمیکلز فراہم نہ کیے جانے کی بنا پر بہت سے تجربے جو مختلف کورسوں میں شامل ہیں تجربہ گاہوں میں نہیں ہو رہے ہیں۔ پچھلے پورے سمسٹر میں کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کی ایم ایس سی پریویس اور ایم ایس سی فائنل کے طالب علموں کو کوئی پریکٹیکل نہیں کرایا گیا۔ مگر طلبا طالبات کو باقاعدگی سے اگلی کلاسوں میں ترقی دی جا رہی ہے۔ جب بعد میں اندرون ملک اور بیرونی دنیا پاکستان کی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو انتظامیہ اس کی ذمہ داری طلبا طالبات پر ڈال دیتی ہے جب کہ انتظامیہ خود طلبا کو مکمل سہولتیں فراہم نہیں کرتی۔

جامعہ کراچی کی گرانٹ میں اضافہ نہ ہونے کی وجہ سے سینئر اساتذہ کو عرصے سے پروفیسر کے گریڈ میں ترقی نہیں دی گئی ہے۔ اگرچہ بہت سے اساتذہ اس ترقی کے لئے تمام شرائط کو پورا کرتے ہیں۔

ایک طرف تو جامعہ کراچی کو مالی خسارے کی وجہ سے اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کی تنخواہیں ادا کرنا انتہائی مشکل

ہو رہا ہے۔ جامعہ کی کارکردگی شدید متاثر ہو رہی ہے تو دوسری طرف جامعہ کراچی کی انتظامیہ پر قابض ایک مخصوص گروہ جامعہ کراچی کی گرانٹ کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ اس گروہ کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے۔ جامعہ کراچی کی گرانٹ اور فنڈ کے غلط استعمال کا سب سے بڑا واقعہ پچھلے دنوں فارمیسی فیکلٹی میں ہوا جہاں پر ڈین فیکلٹی آف فارمیسی ڈاکٹر صاحب نے محض اپنے کمرے اور دفتر کی آرائش و زیبائش پر ایک لاکھ روپے سے کچھ کم کی رقم خرچ کی۔ کہا گیا ہے کہ اس رقم میں سے صرف ۲۶ ہزار روپے کلاس رومز کی کرسیوں پر خرچ کئے گئے۔ مگر کلاس روم کی کرسیاں خریدنے کی بجائے یہ رقم بھی ڈین کے دفتر سے منسلک کونسل روم کے فرنیچر کی خریداری پر خرچ کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے جس خوبصورتی سے اپنے کمرے کو سجایا دیکھنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ اس سے شیخ الجامعہ کے کمرے کی خوبصورتی ماند پڑ گئی ہے۔ ادھر فارمیسی فیکلٹی کے طالب علم یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ پچھلے سال لطیف ابراہیم جمال صاحب نے فیکلٹی کے لئے جو عطیہ دینے کا اعلان کیا تھا نہ جانے وہ رقم کہاں گئی۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۶ء تک بایو کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ اُس سال وہ ٹیچرز سوسائٹی کے صدر منتخب ہو گئے۔ اساتذہ کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دور صدارت میں جو واحد کارنامہ انجام دیا وہ یہ تھا کہ خود کو پروفیسر بنا کر اپنے ڈین فیکلٹی آف فارمیسی

بن گیا۔ جامعہ کراچی میں فنڈ کے غلط استعمال اور گرانٹ کے زیاں کی جتنی دلچسپ وارداتیں ہوتی ہیں ان کی مثال دوسرے تعلیمی اداروں میں ملنا خاصا مشکل ہے۔ مثلاً چند ماہ قبل جب انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کی نئی عمارت مکمل ہوئی تو پرانی عمارت کو ڈھا دیا گیا اور اس میں موجود پوسٹ آفس کے ملبے کو ۶ ہزار روپے میں ایک صاحب کو فروخت کر دیا گیا۔ اور پوسٹ آفس کو نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ مگر پوسٹ آفس والوں نے دفتر میں جگہ کی تنگی کی بنا پر اس دفتر میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ پوسٹ آفس والوں نے مطالبہ کیا کہ ایک اسٹور بنا کر دیا جائے ورنہ وہ جامعہ سے پوسٹ آفس بند کر کے این ای ڈی یونیورسٹی چلے جائیں گے اس پر جامعہ کی انتظامیہ نے ان سے



فارمیسی کے ڈین کے دفتر کا ایک اندرونی منظر

ایک اسٹور تعمیر کرنے کا وعدہ کر لیا اور وہ ملبہ جو جامعہ نے پہلے ۶ ہزار روپے میں فروخت کر دیا تھا۔ اُسے ۱۲ ہزار روپے میں دوبارہ خرید لیا۔ یوں جامعہ کو مبلغ ۶ ہزار روپے کا نقصان ہوا۔

جامعہ میں ایک اور افواہ ہوسٹل کے سامان کی خرید فروخت کے سلسلے میں گشت کر رہی ہے ہوسٹل کے پرووسٹ ڈاکٹر اخلاق نے جامعہ کے ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نیو ہوسٹل کے لئے پلنگ اور پنکھے براہ راست خرید لئے جب کہ قواعد کے تحت یہ خریداری پرچیز ڈیپارٹمنٹ کے توسط سے ہونی چاہیئے تھی۔ اطلاعات کے مطابق لوہے کے ۶۰ پلنگ خریدے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک کی قیمت ۱۹۵ روپے ادا کی گئی ہے جب کہ کراچی کی مارکیٹ میں ایک پلنگ کی قیمت ۱۵۰ روپے ہے۔ اس کے ساتھ ان فرنیچر والوں سے پنکھے بھی خریدے گئے ہیں اصولاً یہ پنکھے کسی کوالیفائیڈ فرم سے خریدنے چاہیئے تھے ایک پنکھے کی قیمت ۵۰۰ روپے ادا کی گئی ہے یہ پنکھے جو ... فلین کہلاتے ہیں ان کی بازار میں قیمت ۴۰۰ روپے فی پنکھا ہے۔ ڈاکٹر اخلاق پر جامعہ کی انتظامیہ کی اتنی مہربانی ہے کہ وہ سال بھر میں دو مکان تبدیل کر چکے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے اپنے بی ٹائپ کے مکان میں جامعہ کے خرچ سے سفیدی کروائی پھر ڈاکٹر حفیظ زیدی کا مکان ۹/۵ جس کو اے ٹائپ کا درجہ دے دیا گیا ہے الاٹ کروا لیا جب کہ اسی مکان کے لئے پولیٹیکل سائنس کے ایسوسی ایٹ پروفیسر سی اے صلاح الدین نے بھی درخواست دی تھی مگر ان کی درخواست محض اس لئے رد کر دی گئی کہ یہ مکان اے ٹائپ کا مکان ہے اور انہیں الاٹ نہیں ہو سکتا مگر ڈاکٹر اخلاق کو یہ مکان الاٹ کر دیا گیا جب کہ وہ بھی اس کے مستحق نہیں تھے کیونکہ وہ خود پروفیسر نہیں تھے۔

جامعہ کراچی کی انتظامیہ نے پچھلے دنوں یہ فیصلہ کیا کہ تمام پروفیسروں کو ۳۰۰ روپے انٹرٹینمنٹ الاؤنس اور ایک اردلی بھی دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ مرکزی حکومت کے اس فیصلے کے بعد کیا گیا جس کے تحت گریڈ ۲۰ ان افسروں کو جو براہ راست عوام سے ملاقات (پبلک ڈیلنگ) کرتے ہیں انہیں ۳۰۰ روپے انٹرٹینمنٹ الاؤنس دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ جامعہ کی انتظامیہ نے اس سے یہ مطلب نکالا کہ کیونکہ پروفیسرز کا بھی ۲۰ گریڈ میں شمار ہوتا ہے اس لئے انہیں یہ سہولت ملنی چاہیئے جب کہ ہر آدمی جانتا ہے کہ پروفیسرز پبلک ڈیلنگ نہیں کرتے اس لئے اس الاؤنس کے ملنے کا کوئی جواز نہیں ہے اب صورت حال یہ ہے جامعہ کے ڈین کی حیثیت میں ۲۰۰ روپے انٹرٹینمنٹ الاؤنس لیتے ہیں اور پروفیسر ہونے کے ناطے انہیں ۳۰۰ روپے اور ملتے ہیں۔ پبلک ڈیلنگ وہ کچھ نہیں کرتے یوں وہ دونوں طرف سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جامعہ کے تعلیمی حلقے اس بات کو خاص طور پر محسوس کر رہے ہیں کہ چند سال قبل ان ہی جیسے الزامات کی بنا پر ڈین فیکلٹی آف فارمیسی ڈاکٹر ظفر غنی اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس ڈاکٹر حفیظ زیدی کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا گیا تھا تو پھر اس دفعہ جامعہ کی انتظامیہ نے کن وجوہات کی بنا پر خاموشی اختیار کر رکھی ہے؟

سامراج نواز پالیسیاں محنت کشوں کو کوڑوں اور قید و بند کی سزائیں

حسن رفیق

اپریل ۱۹۷۸ء میں نویں ورلڈ ٹریڈ یونین کانگریس چیکوسلاواکیہ کے دارالحکومت پراگ میں منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں پاکستان ورکرز فیڈریشن کے آرگنائزنگ سیکرٹری جناب حسن رفیق نے بھی شرکت کی۔ اور کانگریس سے خطاب بھی کیا۔ اُن کی تقریر کا متن درج ذیل ہے ——— (ادارہ) ———

پاکستان ورکرز فیڈریشن کے انقلابی مزدور طبقے کی طرف سے میں اس امر پر اپنے تشکر کا اظہار کرتا ہوں کہ مجھے یہاں آنے اور اس عظیم اجتماع سے خطاب کرنے کا موقع دیا گیا جس میں دنیا بھر کے محنت کشوں کے رہنما شریک ہیں۔ جیولیس فیوچک کے اس شہر میں کانگریس کے انعقاد نے جو سوشلسٹ جمہوریہ چیکوسلاواکیہ کا دارالحکومت بھی ہے حقیقی طور پر کانگریس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

مندوبین خواتین و حضرات، آج دنیا میں تیزی سے ترقی پسندانہ اور مثبت تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ امن آزادی اور سوشلزم کی قوتیں درست طور پر سوشلسٹ کیمپ کی رہنمائی میں نئی فتوحات حاصل کر رہی ہیں۔ لیکن اور جگہوں کے علاوہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ابھی تک ایسے علاقے موجود ہیں جہاں ترقی پذیر ملکوں کی آزادی خود مختاری اور سالمیت کے خلاف سامراج سازشیں جاری رکھے ہوئے ہے۔

میرے وطن پاکستان میں بھی گزشتہ جولائی میں ایک فوجی کے ذریعے وزیر اعظم بھٹو کو معزول کر دیا گیا۔ مارشل لاء حکومت نے تمام ٹریڈ یونین اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی ہے۔ اس حکومت نے بہت سی صنعتوں اور اداروں کو قومی ملکیت سے نکال کر واپس سرمایہ داروں کو دے دیا ہے۔ یہاں ترقی پسندانہ اور مثبت اقدامات کو بھی الٹا دیا ہے جو گزشتہ حکومت نے کیے تھے اب ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی اور حکومت کی سامراج نواز رجعتی پالیسیوں سے حوصلہ پاکر استحصالی قوت اور نوکر شاہی نے اپنی متشددانہ کارروائیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہزاروں مزدوروں کو بے روزگار کر دیا گیا ہے۔ قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ مزدوروں، طلباء، کسانوں اور ترقی پسند سیاسی کارکنوں کو سرسری فوجی عدالتوں سے کھلے عام کوڑے لگائے جانے اور قید و بند کی سزائیں دی جا رہی ہیں۔

کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان کے پرامن ہڑتالی مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں (مبینہ طور پر) ایک سو کے قریب مزدور ان کے بچے اور عورتیں ہلاک ہوئیں۔ کسانوں اور مزارعین کو روزانہ زمینوں سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ ان کو گولیوں سے ہلاک اور بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ خاص طور پر "پٹ فیڈر" بلوچستان اور "ہشت نگر" صوبہ سرحد میں بڑے زمینداروں نے حکومت کی مدد سے بہت کشت و خون کیا۔

مزدوروں اور طلباء کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ٹریڈ یونین کارکنوں، ترقی پسند طلبا اور دوسرے سامراج مخالف عناصر کے خلاف وسیع پیمانے پر زہریلا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ احتساب کے نام پر ان کو خوفزدہ کیا جا رہا ہے۔ اور ان کے خلاف انتقامی کارروائیاں کی جا رہی ہیں۔ معزول وزیر اعظم جناب بھٹو کو ایک قتل کے الزام میں "ایک عدالت" سے پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا ہے۔ اس سزا کے سنائے جانے سے پہلے اور بعد میں ہزاروں سیاسی کارکنوں، مزدوروں، کسانوں اور طلبا کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔

ہماری فیڈریشن اور عمومی طور پر پاکستان کے محنت کش عوام اس سوچ میں بھی رائے کے ہیں کہ موجودہ سامراج نوازلعینی نواز اور رجعتی حقیقت بھٹو کو اس کے صرف ان ترقی پسندانہ اور مثبت اقدامات کی سزا دے رہے ہیں۔ جو اس نے اپنے دور حکومت میں اٹھائے تھے۔ اسی لیے پاکستان کے محنت کش عوام اور دوسرے ترقی پسند عناصر موجودہ حکومت کی معاشی اور سیاسی پالیسیوں کی مخالفت کر رہے ہیں۔

انتہائی مشکل حالات کے باوجود ترقی پسند اور سرگرم ٹریڈ یونین، کسان طلبا، اتحادی کارکن اور عورتیں موجودہ حکومت کی غیر جمہوری، مزدور دشمنی اور سامراج نواز پالیسیوں کے خلاف وسیع تر عملی اتحاد بناتے ہوئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ تاکہ آئی ایل او اور یونائیٹڈ نیشنز کے اعلان ناموں کے مطابق ٹریڈ یونین سرگرمیوں، سیاسی آزادیاں اور انسانی حقوق بحال کروا سکیں۔

ہماری فیڈریشن ملکی اور دوسری سطحوں پر مزدوروں طلبا، کسانوں اور صحافیوں کو مربوط جدوجہد منظم کرنے میں انتہائی بنیادی کردار ادا کر رہی ہے اور ہمیں اعتماد اور یقین ہے کہ محنت کش عوام کی متحد جدوجہد کامیاب ہو گی اور ہمارے عوام ایک ترقی پسند سامراج دشمن جمہوری حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہماری فیڈریشن اور پاکستان کے محنت کش عوام ہمیشہ نوآبادیاتی و جدید نوآبادیاتی نظام نسل پرستی کے خلاف اور آزادی جمہوریت، خوشحالی اور کل انسانیت کے لیے امن کی خاطر جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ ہم اسلحہ کی دوڑ کے خاتمے اور نیوکلیائی ہتھیاروں پر پابندی چاہتے ہیں۔ ہم سامراجی اڈوں خصوصاً ڈیگو گارشیا کے امریکی اڈے کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ہم فلسطینی عوام کے قومی حقوق کے حق میں ہیں اور نسل پرستی کے خلاف ہیں۔ اسرائیلی حکومت کی جانب سے نوآزاد ممالک کے ذاتی معاملات میں مداخلت کی مذمت کرتے ہیں۔

ہماری فیڈریشن ورلڈ فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کی پالیسیوں کی مکمل حمایت کرتی آئی ہے اور کرتی رہے گی نیز ہم اس نویں کانگریس کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کریں گے۔

دنیا بھر کے مزدورو! سوشلسٹ دنیا کی تعمیر کے لیے متحد ہو جاؤ۔

کوئلے کے ذریعہ بجلی پیـ

کول مائینز کے مالکان ایک ٹن کوئلے پر ۵۰ فیصد منافع کما رہے ہیں

احسان عظیم

آج کی صنعتی دنیا کا سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ ایندھن کی فراہمی ہے خصوصاً پاکستان جیسے پسماندہ ملک کو ہر سال اپنے بجٹ کی تقریباً ۱۶٫۷ فیصد رقم ایندھن کی درآمد پر خرچ کرنی پڑتی ہے۔ ملک کی صنعتی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ بنیادی ضروریات کے لئے ہمارا بیرونی انحصار کم سے کم ہو۔ قومی آزادی، ترقی اور خوشحالی کے لئے مقامی وسائل کی دریافت اور استعمال قومی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں تیل اور گیس کے نئے ذخائر کی دریافت کی کوششیں ایک الگ موضوع ہیں۔ لیکن دریافت شدہ وسائل کا بھرپور استعمال بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے۔

تیل کے علاوہ گیس، کوئلہ اور لکڑی کی شکل میں ہمارے پاس ایندھن کے مقامی ذرائع موجود ہیں۔ جنگلات کی کمی کی وجہ سے بطور ایندھن لکڑی کی وافر مقدار کا حصول نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی لکڑی سے ہم اپنی صنعتی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ گیس کی ترسیل کے لئے پائپ لائن کی تنصیب بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے۔ صرف کوئلہ ایک ایسا ایندھن ہے۔ جو ہمارے ملک میں خاصی مقدار میں موجود ہے۔ لیکن عدم توجہی کی بنا پر ہم اس قیمتی قدرتی وسیلے سے تاحال خاطر خواہ طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکے ہیں۔

برِّصغیر کے پاکستانی علاقوں میں کوئلے کی کان کنی ۱۸۸۰ء میں بلوچستان کے ضلع سبّی سے شروع ہوئی۔ کوئلے کی دریافت ریلوے کے ماہرین نے کی۔ سبّی کے مقام کھوسٹ اور زردآلو تک ریلوے لائن بچھائی گئی۔ اور ریلوے کی ضرورت کے لئے کوئلہ نکالا جانے لگا۔ اسی دوران بہار اور بنگال کے علاقہ میں بھی کوئلہ دستیاب ہو گیا۔ یہ کوئلہ کوالٹی کے لحاظ سے بلوچستان کے کوئلے سے بہتر تھا۔

چنانچہ بلوچستان سے کوئلہ نکالنا بند کر دیا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۴۰ء سے بلوچستان کی کانوں سے دوبارہ کوئلہ نکالا جانے لگا۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۷ء تک کے تیس سالوں کے دوران بلوچستان میں کوئلے کی کانوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہو چکی ہے۔ اب بلوچستان میں سبّی کے علاوہ کھوسٹ، شاہ رگ، زردآلو کے علاوہ کوئٹہ۔ سورنج قلات میں ڈیگاری اور مارواڑ ہرناق اور ناکس، کچھی ضلع میں مچھ، لولان، آب گم اور ضلع لورالائی میں لورالائی

بلوچستان میں کوئلے کی

ایک ہزار کانیں اور

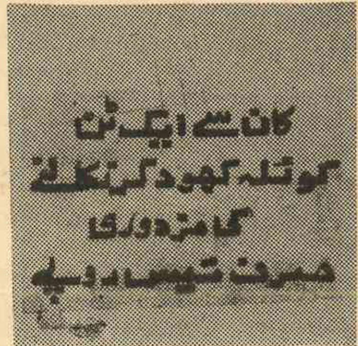
سالانہ پیداوار گیارہ لاکھ ٹن ہے

اور وکی کے علاقہ جات سے کوئلہ نکالا جا رہا ہے۔ بلوچستان میں کوئلے کی اوسط پیداوار گیارہ لاکھ ٹن سالانہ ہے۔

سندھ میں صنعت کان کنی کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تیل کی تلاش کے دوران ضلع دادو کے گاؤں کھانوٹ اور ٹھٹھہ ضلع کے مقام جھمپیر کے درمیان تقریباً ۵۰ میل کی ایک پٹی جسے للیان بلٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، میں کوئلے کا ذخیرہ دستیاب ہوا۔ ۱۹۶۲ء سے نجی مالکان اس بلٹ سے کوئلہ نکال رہے ہیں للیان بلٹ کے چھ ہزار چار سو ایکڑ زمین کے ٹکڑے کو کول فیلڈ قرار دے کر بائیس نجی کمپنیوں کو کان کنی کے لئے پٹے پر دیا گیا ہے۔ موجودہ وقت میں بارہ کمپنیاں کوئلہ نکال رہی ہیں۔ ان میں لمیٹڈ کمپنیاں صرف چار ہیں جب کہ بقیہ آٹھ کمپنیاں لمیٹڈ نہیں ہیں۔ للیان بلٹ پر تقریباً ڈیڑھ سو فٹ کی گہرائی میں کوئلے کی پرت ملتی ہے۔ کوئلے کی پرت ڈیڑھ فٹ سے لے کر ساڑھے آٹھ فٹ تک موٹی ہوتی ہے۔ کوئلے میں گندھک کی مقدار زیادہ ہے، اس لئے جلد تپش دیتا ہے۔ اس بلٹ کی اوسطاً سالانہ پیداوار پانچ لاکھ ٹن ہے۔ کوئلے کی کھدائی کا طریقہ ابھی تک فرسودہ اور افرادی قوت کا رہینِ منّت ہے۔ بجلی کی فراہمی اور میکنائزیشن کے رواج کے ذریعہ کوئلے کی پیداوار کو فوری طور پر دگنا اور باقاعدہ استعمال کے ذریعہ پانچ گنا تک اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

سندھ میں کوئلے کی کان کنی کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ بیشتر کانوں میں مزدوروں کی رہائش اور دیگر سہولیات کا تو ذکر ہی کیا پینے کے پانی کی فراہمی نہیں کی گئی ہے۔ کان کنی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ماہرین کی کمیابی ہے۔ کان کنی کی صنعت پر توجہ نہ دیئے جانے کی وجہ سے ماہر انجینئر اور کاریگر ناپید ہیں۔ اس طرح کوئلے کی خاصی بڑی مقدار ضائع ہو جاتی ہے۔ تکنیکی مہارت کی کمی اور نجی مالکان کی لالچ کے نتیجہ میں کانوں کے اندر حادثات کی شرح بہت زیادہ ہے۔ اکثر کانیں بغیر اجازت کام کر رہی ہیں۔ کانوں میں حفاظتی آلات اور تدابیر برائے نام اختیار کی گئی ہیں۔ سندھ میں کوئلے کی کان کنی کی رائیلٹی وفاقی حکومت وصول کرتی ہے جب کہ صنعت کی ترقی اور مزدوروں کی بہبود پر کوئی موثر توجہ نہیں دی گئی ہے۔ وفاقی حکومت صوبائی حکومت اور لوکل سیلف اداروں کو کوئلے سے مجموعی طور پر ساڑھے سات روپے فی ٹن وصولی ہوتی ہے۔ وصولی کی اس رقم میں ایک روپیہ فی ٹن روڈ سیس وصول کیا جاتا ہے۔ روڈ سیس

...دا کرنے کی تجویز فیوز ہو گئی



کی مد میں حکومت کو اوسطاً پانچ لاکھ سالانہ وصول ہوتا ہے پندرہ سال کے عرصے میں حکومت ۵۔۷ کروڑ سے زائد رقم بطور رویلٹی حاصل کر چکی ہے لیکن کوئلے کی کانوں سے انڈس ہائی وے، قومی شاہراہ اور سپر ہائی وے تک پختہ لنک روڈ تعمیر نہیں کیا گیا ہے اسی طرح لیبر ویلفیئر فنڈ میں بھی ایک کروڑ کے لگ بھگ رقم اب تک حاصل کی جا چکی ہے لیکن کارکنوں اور ان کے خاندان کے لئے رہائشی کالونی اسکول، اسپتال اور دیگر ضروریات اور سہولیات کی فراہمی پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔

سندھ میں کوئلے کی صنعت سے چھ ہزار کے قریب مزدور وابستہ ہیں جب کہ سیزن کے دوران تعداد بعض اوقات دگنی سے زائد ہو جاتی ہے۔ مزدوروں کی کم شعوری اور تنظیم کے فقدان کی وجہ سے ایک طویل عرصہ تک مزدوروں کو برائے نام اُجرت دے کر ان کا زبردست استحصال کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک مزدوروں کو کوئلے کی کھدائی فی ٹن ساڑھے سات روپے ادا کی گئی جب کہ مالکان نے تمام اخراجات کی منہائی کے بعد پچاس روپے سے ساٹھ روپے فی ٹن منافع کمایا۔ کان کنی کی صنعت کی نگرانی اور مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری محکمہ محنت اور ڈائریکٹوریٹ کول مائنز پر عائد ہوتی ہے لیکن مزدوروں کو شکایت ہے کہ حکام اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے۔ مزدوروں کے حقوق ... کی چشم پوشی کے نتیجہ میں ... کی مزدور دشمنی اور قانون

تشنگی انتہا تک پہنچی۔ صنعت کان کنی میں اکثر ایسے مالکان بھی ہیں جو صنعت سے وابستہ مزدوروں کو غلام کا درجہ دیتے ہیں۔ اسی لئے کسی حق یا مراعات کے لائق نہیں سمجھتے ایک ایسے ہی مالک کے بارے میں شکایت ہے کہ وہ قانونی مراعات تو دور کی بات ہے کام کے دوران حادثے کی شکل میں بھی کوئی معاوضہ نہیں دیتے۔ معاوضہ سے بچنے کے لئے حادثے کو ذاتی لڑائی یا زہر خورانی قرار دے کر متوفی کے ورثا کو مراعات سے محروم کر دیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا اس لئے کر پاتے ہیں کہ سابقہ حکومتوں کے دور میں خود صوبائی رکن ہوتے تھے اور ان کے بڑے بھائی پہلے بی ڈی چیئرمین پھر منسٹر تھے۔ ہر حکومت میں انہیں سندِ قبولیت حاصل تھی۔ اس لئے قاعدے قانون کی پاسداری کا سوال ہی نہیں تھا۔

ہم نے صنعت سے متعلق امور کے بارے میں مالکان کا موقف جاننا چاہا۔ ایچ ایم حبیب اللہ کول مائنز سے رابطہ کیا۔ کمپنی کے ترجمان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی مائنز میں قانونی ذمہ داری پوری کی ہے۔ کانوں کے اندر حفاظتی آلات فراہم کئے گئے ہیں۔ مزدوروں کی بہبود کے ضمن میں بھی نمایاں کام کیا ہے۔ ان کے بقول کانوں کے ساتھ پختہ کالونی تعمیر کی ہے۔ پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے دو کنوئیں کھدوائے ہیں۔ روشنی کے لئے جنریٹر لگایا ہے۔ رہائشی کالونی میں ڈسپنسری، فیئر پرائس شاپ کے علاوہ اسپورٹس کی سہولیات بھی فراہم کی ہیں۔ ترجمان کا کہنا ہے کہ اصولاً رہائش، علاج و معالجہ اور صحت و تندرستی کی ذمہ داری حکومت کو پوری کرنی چاہیئے۔ مزدوروں کی بہبود کے نام پر حکومت ویلفیئر فنڈ میں مالکان سے خاصی بڑی رقم سالانہ وصول کرتی ہے لیکن حسب ضرورت سہولیات فراہم نہیں کی گئی ہیں۔

مائنز کی ترقی کے سلسلہ میں ان کا موقف ہے کہ صنعت کان کنی کی ترقی کے لئے کانوں تک پختہ راستہ، بجلی اور پانی کی فراہمی کی فوری ضرورت ہے۔ نیز کان کنی کی جدید ٹیکنالوجی اور جدید مشینری کا استعمال وقت کی ضرورت ہے۔ اس سمت خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے ٹیکنیکل افراد ملک کا سرمایہ ہیں۔ لیکن ان کی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کئے جانے کی وجہ سے ٹیکنیکل افراد ملک چھوڑ کر باہر جا رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ماہرین کے ملک سے باہر جانے پر پابندی عائد کی جائے۔ ان کی ماہرانہ صلاحیتوں کا فائدہ اٹھا کر صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کر کے خود کفالت کی منزل کی طرف گامزن ہونا ممکن ہو۔ جدید مشینری نہ ہونے کی وجہ سے کوئلے کی کھدائی غیر معیاری ہوتی ہے۔ خرچ بھی زیادہ آتا ہے اور کوئلے کی بڑی مقدار ضائع ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جدید مشینری کے استعمال سے کوئلے کی کھدائی کی لاگت میں کم از کم تین چوتھائی کمی ہو سکتی ہے۔ کان کنی کی صنعت کو درپیش مسائل کے حل کے سلسلہ میں کان کنی کے مالکان کی انجمن نے حکومت سے رجوع کیا ہے۔ ان کے خیال میں ملک کی معاشی پالیسی پر مکمل نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ لیبر اصلاحات اور صنعتی پیداوار میں توازن پیدا کیا جانا چاہیئے۔ صنعت مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہے اسے منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ آمدنی کے لحاظ سے خرچ کیا جائے۔ غیر پیداواری اخراجات میں کمی کر کے وسائل سے باہر رہنے کی عادت ترک کی جائے۔ تاکہ خود کفالت کی طرف قدم بڑھایا جا سکے۔ ترجمان کے مطابق کوئلے کی صنعت کو مربوط منصوبہ بندی کے ذریعہ نیوکلیئر پاور پلانٹ کے لئے کوئلہ کی فاضل مقدار بطور ایندھن حاصل کی جا سکتی ہے۔

سندھ میں کوئلے کی صنعت سے وابستہ مزدوروں کا کہنا ہے کہ سندھ میں دس سال سے زائد عرصے تک مزدوروں کو قانونی مراعات تک پوری طرح نہیں دی گئیں صنعت کان کنی میں ۱۹۷۳ء میں پہلی دفعہ ٹریڈ یونینوں کی تشکیل ہوئی۔ خانوٹ میں چھ نجی کمپنیاں کان کنی سے

چور بازاری کو چھپانے کے لئے پیداوار کم ہونے کا بہانہ بنایا جاتا ہے

مائنز ویلفیئر فنڈ کہاں جاتا ہے؟

وابستہ ہیں جب کہ جھمپیر میں تین کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔

کان کنی کی صنعت میں مزدوروں کی منظم جدوجہد سب سے پہلے ایچ ایم حبیب اللہ کول مائنز میں شروع ہوئی۔ بات ہڑتال تک پہنچی۔ ڈھائی مہینے کی طویل ہڑتال کے بعد مزدور مطالبات منوانے میں کامیاب ہوتے۔ ہڑتال کی کامیابی کے نتیجہ میں مزدوروں کا اپنی منظم جدوجہد پر اعتماد مضبوط ہوا۔ دوسری کمپنیوں کے مزدوروں میں بھی جذبہ مضبوط ہوا۔ یونین کی تشکیل سے پیشتر مزدوروں کو فی ٹن کوئلے کی کھدائی صرف پونے آٹھ روپے مں دی جاتی تھی جب کہ مالکان یہی کوئلے سوا سو روپے ٹن فروخت کرتے تھے۔ مزدوروں کو گریجویٹی، بونس، رہائش چھٹیاں اور علاج و معالجہ کی سہولیات حاصل نہیں تھیں۔ پہلے معاہدے کے ذریعہ مزدوروں کی مزدوری میں صرف ایک روپے ٹن کا اضافہ کیا گیا جب کہ مالکان نے کوئلے کی فروخت کی قیمت تین سو روپے ٹن مقرر کردی۔ ڈھائی مہینے کی ہڑتال کے بعد مزدوری بائیس روپے ٹن، بونس کمپنی کے منافع کا پانچ فیصد اور جمعداروں کے کمیشن میں پچاس فیصد اضافہ تسلیم کیا گیا۔ علاج و معالجہ کے لئے سائٹ پر کمپونڈر اور زیادہ بیماری کی صورت میں شہر میں علاج کی سہولت حاصل ہوئی۔ مفت رہائش، سالانہ چھٹیاں وغیرہ دینا تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدے کے چار ماہ بعد ایک اور معاہدے کے ذریعے مزدوری کا ریٹ تیس روپے فی ٹن مقرر ہوا۔

مزدوروں کے مطابق کوئلے کی کھدائی سے لے کر فروخت کے مرحلے تک بمعہ رائلٹی اور سرکاری ٹیکس وغیرہ جملہ لاگت صرف ۴۰ روپے بنتی تھی۔ جب کہ مالکان ۳۰۰ روپے ٹن کوئلہ فروخت کرکے تین سو گنا منافع کما رہے تھے اس صورت حال کے پیش نظر حکومت نے کوئلے کی فروخت کا نرخ ایک سو اڑتیس روپے ٹن مقرر کردیا۔ سرکاری قیمت مقرر ہونے کے بعد بھی کمپنی کا منافع ۵۰ فیصد رہا۔ پاکستان کی کسی دوسری صنعت کو منافع کی اتنی بڑی شرح مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ سرکاری طور پر منافع کی اتنی بڑی شرح کے باوجود مالکان کی ہوس منافع گیری کم نہیں ہوئی۔ انہوں نے منافع کی سابقہ شرح برقرار رکھنے کے لئے کوئلے کی بلیک شروع کی۔ مزدوروں کے مطابق بعض کمپنیاں کوئلہ بلیک میں دو سو روپے ٹن فروخت کر رہی ہیں۔ بلیک کو چھپانے اور قانون کے دباؤ سے بچنے کے لئے پیداوار میں کمی کا بہانہ بنایا جاتا ہے اکثر مزدوروں کی فرضی ہڑتال ظاہر کرکے پیداوار کو بلیک میں فروخت کے لئے جمع کیا جاتا ہے۔

موجودہ وقت میں کوئلے کے سب سے بڑے صارف اینٹوں کے بھٹے والے ہیں۔ ہم نے بھٹے والوں سے کوئلے کی فراہمی کی صورت حال سمجھنا چاہی۔ دادو کے ایک بھٹے والے نے شکایت کی کہ مالکان کوئلے کی کمی کا بہانہ بنا کر دادو، لاڑکانہ اور سکھر جیسے دور دراز علاقوں کو کوئلہ فراہم نہیں کرتے۔ مجبوراً ہمیں کنٹرول سے زائد قیمت پر بلیک میں مالکان سے کوئلہ خریدنا پڑتا ہے مالکان نے کوئلے کی بلیک کے لئے ایجنسی کا طریقہ بنا رکھا ہے۔ مالکان کنٹرول ریٹ پر اپنا کوئلہ اپنی ہی ایجنسی کو فروخت کر دیتے ہیں۔ پھر یہ ایجنسی والے کنٹرول سے زائد نرخ پر کوئلہ فروخت کرتے ہیں۔ اگر ان کی مقررہ قیمت پر اعتراض کیا جائے تو وہ مال نہ ہونے کا بہانہ بنا کر کوئلے کی فراہمی سے انکار کر دیتے ہیں۔

کان کے ایک مالک کے بارے میں مزدور اور صارف دونوں شکایت کرتے ہیں کہ وہ ایک طرف ضروری آلات و اوزار اور بوریوں وغیرہ کی فراہمی میں مصنوعی دشواری بنا کر پیداوار گراتے رہتے ہیں اس طرح ایک طرف مزدوروں کو جو پیس ریٹ پر کام کرتے ہیں۔ انہیں معاشی مار مارتے ہیں۔ دوسری طرف پیداوار کی کمی کا بہانہ بنا کر مقررہ سرکاری نرخ سے زیادہ قیمت پر کوئلہ فروخت کرکے صارف کا استحصال کرتے ہیں اس مالک کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ مالک نے اپنا بھی اینٹوں کا بھٹہ لگا رکھا ہے۔ اس طرح دیگر بھٹے والوں کو مشکلات میں مبتلا کرکے اینٹوں کے میدان میں بھی اپنی چودھراہٹ قائم کئے ہوئے ہیں۔

محکمہ لیبر اور انسپکٹوریٹ مائنز کی فرائض سے غفلت اور مجرمانہ چشم پوشی کے نتیجہ میں بیشتر مالکان آج تک قوانین پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔ اکثر کانوں میں پانی کی فراہمی کا معقول انتظام نہیں ہے۔ ایک ایسی کان پر پینے کے پانی کے بند ٹینک کی جگہ کھلا ٹینک قانون کا منہ چڑھاتا نظر آتا ہے۔ ٹینک میں کتے اور دیگر جانوروں کا داخل ہونا عام بات ہے۔ اکثر کانوں کے منہ پر ورانڈے تعمیر نہیں کئے گئے ہیں۔

رہائشی سہولیات میں بھی بہتری نہیں کی گئی ہے۔ مزدوروں کو رخصت کے دن شہر پہنچنے کے لئے سواری نہیں فراہم کی جاتی۔ کانوں میں مزدوروں کی مقررہ تعداد بھرتی نہیں کی جاتی۔ بعض کانوں کے لیبر جمعداروں کو بونس اور دیگر مراعات نہیں دی جاتیں۔ اسی طرح اکثر کانوں کے ڈھلائی کرنے والے مزدوروں کو بونس نہیں دیا جاتا۔ سیفٹی کے انتظامات میں کمی کی وجہ سے بیشتر کانوں میں حادثات کی شرح بہت زیادہ ہے۔ اکثر کانوں میں روشنی کا بندوبست نہیں ہے اندھیرے کی وجہ سے رات میں اکثر مزدور کانوں میں گر جاتے ہیں۔ قانون کی خلاف ورزی پر اول تو مائنز انسپکٹر چالان نہیں کرتے اور جب رسم پوری کرنے کے لئے چالان ہوتا ہے تو ان پر انتہائی معمولی جرمانہ ہوتا ہے۔ اس طرح قانون شکنی کرنے والے مالکان کو دیدہ دلیری کی کھلی چھوٹ حاصل ہے۔

مزدوروں کو ایک بڑی شکایت یہ ہے کہ مختلف مزدور قوانین کے تحت قوانین کی نگرانی کی اتھارٹیز الگ الگ مقرر ہیں۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ مزدور اگر مزدور قوانین کی شکایت انسپکٹر مائنز سے کرتا ہے تو وہ لیبر ڈیپارٹمنٹ کی طرف بھیجتے ہیں۔ اور لیبر ڈیپارٹمنٹ انسپکٹر مائنز کی جانب۔ اختیارات کی دوعملی کے نتیجہ میں نقصان صرف مزدوروں کا ہوتا ہے۔ مائنز ویلفیئر فنڈ کی رقوم ڈائریکٹوریٹ مائنز کے پاس جمع ہوتی ہے۔ لاکھوں کی رقم جمع ہونے کے باوجود مزدوروں کی بہبود کے لئے کوئی نمایاں کام نہیں کیا گیا ہے۔

للیان بلٹ کے لاکھڑا کے کوئلے کے ذخائر اور اس کے استعمال کے سلسلہ میں گذشتہ دنوں حکومت نے کینیڈا کی ایک فرم "سیڈا" سے سروے کرایا تھا۔ اطلاعات کے مطابق "سیڈا" نے اپنی رپورٹ وفاقی حکومت کو پیش کر دی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ رپورٹ میں لاکھڑا کول فیلڈ کے ذخائر کو الیکٹرک پاور پلانٹ کے لئے قابل استعمال قرار دیا ہے۔ لاکھڑا کے کوئلے کے ذخیرے سے ڈھائی سو میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کے لئے کول پاور قائم کیا جانا ہے۔ پاور اسٹیشن واپڈا کے

ذریعے لگایا جاتا ہے گا۔ جس پر تقریباً پندرہ کروڑ لاگت آئے گی لیکن معیشت کے لئے بنیادی اہمیت کے اس منصوبے پر عمل درآمد کا مسئلہ سرد خانے کی نذر ہے۔ قومی معیشت کی ترقی کے لئے بجلی کی پیداوار میں اضافہ ضروری ہے۔ بجلی کی پیداوار کے سلسلے میں لاکھڑا کے کوئلے کے ذخائر کی ماہرانہ رپورٹ مکمل ہونے کے باوجود کوئلے کی صنعت پر توجہ نہ دینا قومی معیشت کی ترقی سے انکار کے مترادف ہے۔ دوسری طرف کوئلے کے ذخیرے کو کام میں نہ لانے کے نتیجے میں علاقے کی ترقی بھی متاثر ہو رہی ہے

●

تفریحی پارک کی بقا کا مسئلہ حل نہیں

نواب شاہ

محمد نواز خلجی

الشمس اور البدر ظلم و بربریت کی علامت ہیں

البدر اور الشمس کا نام سنتے ہی ہر محب وطن پاکستانی کے ذہن میں جماعت اسلامی کی ان مسلح تنظیموں کا تصور ابھر آتا ہے جو جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان میں قائم کی تھیں اس کے ساتھ ساتھ ان تنظیموں نے مشرقی پاکستان کے عوام پر جو بہیمانہ مظالم ڈھائے وہ بھی ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں حالانکہ ان تنظیموں کا ہر ظلم و ستم پاکستان کی مسلح افواج کے کھاتے میں لکھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی جب مشرقی پاکستان میں مسلح افواج کے ہتھیار ڈالنے کا واقعہ یاد آتا ہے تو دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔

جماعت اسلامی کی ان مسلح البدر اور الشمس جیسی تنظیموں کا ذکر جب ایک سچے پاکستانی کے سامنے آتا ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے یہ تو صرف وہی جان سکتا ہے جو کہ ایسے حالات سے دوچار رہا ہو۔

گزشتہ دنوں نواب شاہ کے قلب میں مقامی مارشل لاء حکام کی مرضی سے ریڑھی والوں کو سیٹ کرنے کے لئے نواب شاہ کے ایک تفریحی پارک میں ایک مارکیٹ قائم کی گئی ہے اس کے لئے پلان بنا کر مارشل لاء حکام کی موجودگی میں دکانیں بھی الاٹ کر دی گئی تھیں اس وقت نوابشاہ شہر میں ضلعی انتظامیہ پر جماعت اسلامی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے لہذا اس مارکیٹ کا نام بھی البدر مارکیٹ منتخب کیا گیا ہے گویا ضلعی انتظامیہ نواب شاہ کے عوام کو بار بار سانحہ مشرقی پاکستان یاد دلا کر ان کے ان زخموں کو ہرا کرنا چاہتی ہے جنہیں وقت آہستہ آہستہ مندمل کرتا جا رہا ہے۔

مسلمانوں نے میدان بدر میں جو فتح و نصرت حاصل کی تھی اسے دیکھتے ہوئے بدر کا لفظ مسلمانوں کے لئے عزت و عظمت کا نشان بن گیا ہے۔ لیکن جماعت اسلامی کی مسلح تنظیم البدر نے ظلم و بربریت کا مظاہرہ کر کے مشرقی پاکستان میں ہماری عزت کے پرچم سرنگوں کر کے ایک ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا۔ لہذا البدر کا نام سن کر کسی بھی پاکستانی کا چونک جانا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

دوسرے اس مارکیٹ کو نواب شاہ کے ایک تفریحی پارک میں تعمیر کیا جا رہا ہے جبکہ موجودہ حکومت کی پالیسی کے تحت ان تمام تفریحی مقامات کو خالی کرایا جا رہا ہے جنہیں سابقہ حکومت نے بندر بانٹ کے ذریعے اپنے لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ نواب شاہ میں ایک تفریحی پارک پر مارکیٹ کی تعمیر موجودہ حکومت میں معنی خیز دکھائی دیتی ہے جبکہ نواب شاہ میں کوئی بھی تفریحی پارک موجود نہیں اگر ایک آدھ ہے بھی تو اس کی دیکھ بھال اچھی طرح نہیں کی جاتی اس کے علاوہ حکام کا دعویٰ ہے کہ وہ یہ مارکیٹ قائم کر کے شہر سے ریڑھی والوں کا خاتمہ کر دینگے جو قطعی ناممکن ہے یہ دعویٰ اس دور میں بالکل وہی حیثیت رکھتا ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں سورج کو زمین پر اتار سکتا ہوں۔ اس لئے کہ موجودہ ریڑھی والے ان دکانداروں کے رشتہ دار ہیں۔ جن دکانوں کے سامنے وہ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ ان لوگوں سے باقاعدہ کرایہ وصول کرتے ہیں لہذا اگر موجودہ ریڑھی والے یہاں سے ہٹ گئے تو کچھ عرصہ بعد یہاں ان کے دوسرے رشتہ دار آ کر قابض ہو لیں گے۔ اس لئے نواب شاہ شہر کے ایک تفریحی پارک کو محض اس امید پر ختم کرنا بے کار ہے کہ اس طرح نواب شاہ شہر ریڑھی والوں سے پاک ہو جائے گا۔

ہم ریڑھی والوں کی آباد کاری کے مخالف نہیں ہیں اس لئے کہ وہ غریب ہیں لہذا اگر موجودہ مارشل لاء حکام اور ضلعی حکام واقعی انہیں آباد کرنے کے خواہشمند ہیں تو انہیں فردوس ہوٹل کے سامنے والے میدان میں دکانیں دے دی جائیں اس طرح ایک بڑا تجارتی مرکز بھی قائم ہو جائے گا اور تفریحی پارک بھی بچ رہے گا ہم انتظامیہ سے یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ وہ اس مارکیٹ کا نام البدر کی بجائے کوئی اور نام رکھ دیں گے۔

بقیہ : روس اور پاکستان

نافذ ہو گیا۔ جمہوری ادارے توڑ دیئے گئے۔ آئین معطل ہو گیا اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے دوبارہ انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ لیکن وہائٹ ہاؤس کی رپورٹوں میں دوبارہ الیکشن میں پھر پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے جیت رہی تھی۔ لہٰذا نیویارک ٹائمز نے تقریباً بیس دن قبل پاکستان میں انتخابات کے ملتوی ہو جانے کی خبر دے دی جس کی تصدیق جنرل ضیاء الحق نے یکم اکتوبر کو الیکشن ملتوی کرنے کا اعلان کر کے کر دی۔

۵۔ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد سے جنوبی ایشیا کی سیاست میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اہم امریکی اور برطانوی شخصیتیں جنوبی ایشیا کے دورے پر آئیں۔ ان کے علاوہ علاقائی سطح پر بھی اہم سیاسی شخصیتوں نے ایک دوسرے کے ملکوں کے دورے کیے۔

• ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد سب سے پہلے امریکی بحریہ کے ایڈمرل پاکستان کے دورے پر آئے۔ انہوں نے پاک افغان سرحد کا معائنہ کیا۔ اس کے علاوہ پشاور میں فضائیہ کے ہیڈ کوارٹر کا دورہ بھی کیا۔ اس کے بعد ایک اور اہم امریکی شخصیت نے پاکستان کا خفیہ دورہ کیا۔ جنرل ضیاء سے ری پروسیسنگ پلانٹ کے مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا اور پھر یہاں سے نئی دہلی روانہ ہو گئے۔ اس بات کا انکشاف جناب بھٹو نے کیا جس کی بعد میں دفترِ خارجہ کو بھی تصدیق کرنی پڑی۔

• جنرل ضیاء تقریباً سات بار تہران کے دورے پر گئے۔ اس کے علاوہ آغا شاہی علیحدہ وقتاً فوقتاً تہران جاتے رہے ہیں۔ شہنشاہِ ایران نے افغانستان، ایران، پاکستان، نیپال اور بنگلہ دیش پر مشتمل ایک مشترکہ اقتصادی منڈی کی تجویز پیش کی۔

• جنرل ضیاء الحق کابل کے دورے پر گئے جس کے بعد ولی خان اور ان کے ساتھیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔

• دسمبر ۱۹۷۷ء کو بنگلہ دیش کے صدر جنرل ضیاء الرحمٰن نیپال، انڈیا اور پاکستان کے دورے پر آئے۔ فرخا بیراج کا سولہ سال پرانا تنازعہ بنگلہ دیش اور ہندوستان کے درمیان طے پایا۔

• دسمبر ۱۹۷۷ء میں نیپال کے شاہ نے بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کیا۔

• دسمبر ۱۹۷۷ء ہی میں بھارتی وزیر اعظم بھی نیپال اور بنگلہ دیش کے دورے پر گئے۔

• اس سال جنوری ۱۹۷۸ء کو امریکی صدر جمی کارٹر پہلی بار ایران اور ہندوستان کے دورے پر آئے۔ اپنے اس دورے میں انہوں نے برصغیر میں ہندوستان کو بالادستی بخشی اور اس علاقے کے تمام ملکوں کے لئے ہندوستان کو ایک سیٹلائٹ سسٹم کا نظام بطور تحفہ دینے کا اعلان بھی کیا۔ اس سے قبل بھارت میں امریکی سفیر نے برصغیر میں امریکی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ امریکہ نے برصغیر میں ہندوستان اور پاکستان کے بارے میں مساوی حیثیت کو ترک کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ گذشتہ برسوں میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہے، وہ کھیل اب ختم ہو چکا ہے اور امریکی صدر نے اپنے سفیر کے ان خیالات سے بھرپور اتفاق کرتے ہوئے برصغیر کے دورے میں پاکستان کو کوئی اہمیت نہیں بخشی۔

• جنوری ۱۹۷۸ء کو صدرِ امریکہ کے دورے کے فوری بعد برطانوی وزیر اعظم مسٹر کلیہان، ہندوستان بنگلہ دیش اور پاکستان کے دورے پر آئے۔ وزیر اعظم کلیہان کا رویہ بھی امریکی صدر کے رویئے سے کسی طرح مختلف نہیں تھا۔ وہ خود کو پاکستان کا وائسرائے سمجھ رہے تھے۔ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرح پاکستان کے سیاستدانوں کو نصیحتیں کرنے لگے کہ اگر سیاستدان اور سیاسی جماعتیں اپنا طرزِ عمل درست کر لیں اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر لیں تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں ۱۹۷۸ء میں جمہوریت بحال ہو جائے گی۔ اور پاکستان کے تمام شکست خوردہ سیاستدانوں سے کلیہان کا تعارف بھی کرایا گیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم پھر برطانوی نو آبادی بن گئے ہیں۔ جو ہمارے پرانے آقا، پاکستان کے سیاستدانوں کو اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے پاکستان کو ری پروسیسنگ پلانٹ کے مسئلے پر بھی صدر جمی کی نیک نیتی کی بھرپور حمایت کی۔ وزیر اعظم کلیہان نے بھی دبی دبی زبان میں "ہندوستان" کو علاقہ کا چوہدری قرار دیا۔

• فروری ۱۹۷۸ء کو شہنشاہِ ایران نے ہندوستان کا دورہ کیا اور واپسی پر کچھ دیر کے لئے پاکستان میں بھی قیام کیا۔

• فروری ۱۹۷۸ء ہی میں ہندوستان کے وزیر خارجہ پاکستان کے سرکاری دورے پر آئے۔ ہندوستانی وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی سے پاکستان کے عوام اچھی طرح واقف ہیں۔ باجپائی "اکھنڈ بھارت" تحریک کے ایک سرگرم رہنما ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی جماعت مہاسبھا نے کھل کر قیامِ پاکستان کی مخالفت کی لیکن قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے پاکستان کو ختم کر کے ہندوستان کو دوبارہ متحد کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۳ء میں باجپائی نے شملہ معاہدے کی سخت مخالفت کی تھی اور اس معاہدے کے خلاف ہندوستان میں مظاہرے کرائے اور جلوس بھی نکلوائے۔ لیکن فروری ۱۹۷۸ء میں وہی باجپائی ہندوستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے پاکستان کے خیر سگالی دورے پر تشریف لائے۔ اپنے اس دورے میں اخباری نمائندوں سے گفتگو کے دوران انہوں نے ڈپلومیٹک زبان میں یہ واضح کر دیا کہ کشمیر اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ گذشتہ تیس برسوں میں کشمیر کے دریاؤں میں خاصا پانی بہہ چکا ہے اور اس وقت پاکستان میں عبوری حکومت قائم ہے۔ لہٰذا کشمیر کے مسئلے پر ویسے بھی عبوری حکومت سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔

• لیکن اپریل ۱۹۷۸ء کو پاکستان کے امور خارجہ کے سیکرٹری آغا شاہی نے عبوری حکومت کے مشیر کی حیثیت سے دہلی کا سرکاری دورہ کیا۔ اور جہاں انہوں نے ہندوستان کے ساتھ سلال ڈیم کا معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے سے ہندوستان کو فائدہ پہنچے گا یا پاکستان کو نقصان پہنچا، یہ بات تو وقت گذرنے کے ساتھ محسوس کی جائے گی۔ ویسے پاکستان میں جب بھی غیر منتخب اور غیر سیاسی حکومتیں برسرِ اقتدار آئی ہیں، دوسرے ملکوں نے ہمیشہ اپنے مفادات کے لئے فائدے اٹھانے کی کوششیں کی ہیں۔ ایوب خان نے بھی ہندوستان کے ساتھ بغیر سوچے سمجھے پانچ دریاؤں کا سودا کر لیا تھا۔ اور تاشقند کا معاہدہ بھی ہندوستان کی شرائط کے مطابق طے پایا۔

• مارچ ۱۹۷۸ء کو افغانستان کے صدر سردار داؤد نے ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کیا۔ پاکستان کے ذرائع نشر و اشاعت نے سردار داؤد کی آمد پر خصوصی پروپیگنڈے کا اہتمام کیا۔ ضرورت سے زیادہ سرکاری پروٹوکول دیا گیا۔ مخصوص سیاست دانوں سے انہیں ملوایا گیا۔ اور اپنی واپسی سے قبل اخباری نمائندوں سے گفتگو کے دوران انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ افغانستان، پاکستان کے ساتھ اپنے تنازعہ کا مذاکرات کے ذریعے پُرامن حل چاہتا ہے۔

• مئی ۱۹۷۸ء کو امریکہ کے سابق نائب صدر راکفیلر بھی برصغیر کے نجی دورے پر آئے۔ پاکستان میں

انہیں سرکاری پروٹوکول دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے استقبالیہ بھی دیا۔ حالانکہ ان کا دورہ نجی نوعیت کا تھا۔ انہیں بھی پاک افغان سرحد دکھائی گئی۔ سرکاری نشرواشاعت کے اداروں نے ان کی نجی مصروفیات کو خصوصی اہمیت کے ساتھ نشر کیا۔ پاکستان کے دورے کے بعد راکفیلر ہندوستان بھی گئے۔ افغانستان میں انقلاب کی وجہ سے وہاں کا دورہ منسوخ ہو گیا۔

• اسی طرح موجودہ عبوری حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے گیارہ ماہ میں، برِصغیر کی سیاست میں عالمی اور علاقائی سطح پر سفارتی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں جس کے نتیجے میں جنوبی ایشیا کی سیاست میں اہم سیاسی تبدیلیاں رُونما ہوئیں اور اس علاقہ کی سیاست کا مرکز ایک بار پھر اسلام آباد سے دہلی کی جانب شفٹ ہو گیا۔ اور اس بات کی اہمیت کا اندازہ انہی گیارہ ماہ میں چین اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کی بحالی، اور تجارتی وفود کے تبادلوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ امریکہ اور مغربی یورپ کے صنعتی ممالک نے جنوبی ایشیا کی سیاست میں ہندوستان کو ترجیح دینا شروع کر دی ہے۔ اور اس سلسلے میں ہندوستان کے وزیرِ اعظم مرارجی ڈیسائی کا حالیہ دورہ برسلز اور برطانیہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں انہوں نے یورپی اقتصادی منڈی کے اراکین سے بھارت اور یورپی ملکوں کے درمیان تجارت کے مزید فروغ پر تبادلۂ خیال کیا۔

• امریکہ اور مغربی ملکوں نے پاکستان کو یا تو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ہے یا پھر اپنے مفادات کی تکمیل کی حد تک اہمیت دی ہے۔ دوسری جانب ہندوستان میں سیاسی استحکام اور ایک صحت مند جمہوری ماحول نے امریکہ اور یورپ کے صنعتی ملکوں کو ہندوستان کی اہمیت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کے فروغ اور سیاسی استحکام کی راہ میں جہاں جاگیردارانہ سیاسی ذہنیت اور رجعت پسند سیاسی رہنما ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ وہاں ترقی پذیر ملکوں کو مالی امداد فراہم کرنے والے عالمی مغربی ادارے بھی برابر کے شریک ہیں۔ جو ترقی پذیر ملکوں کی حکومتوں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال ہونے پر مجبور کرتے ہیں اور اپنے اس مقصد میں ناکامی کے سبب ایسی حکومتوں کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اور اس کی ایک واضح مثال چلی میں آلندے کی حکومت بھی ہے۔ پاکستان میں ایک منتخب سیاسی حکومت کے قیام کے بعد سیاسی استحکام فروغ کی راہوں پر گامزن تھا۔ خارجہ پالیسی "دوطرفہ تعلقات" پر مبنی خطوط پر تشکیل دی گئی تھی جس کی وجہ سے پاکستان تیسری دنیا کے ملکوں کے قائد کی حیثیت سے ابھر رہا تھا اس کے علاوہ مغربی ملکوں کے مالی اداروں پر سے اقتصادی انحصار بھی کم ہوتا جا رہا تھا اور پاکستان کو مالی امداد دینے والے بڑے ملکوں میں سعودی عرب، کویت، لیبیا اور ایران کا شمار ہونے لگا تھا صرف ۱۹۷۵ء میں سعودی عرب نے پاکستان کو ۴۶ء۸ ملین ڈالر کی امداد فراہم کی جب کہ ایران نے ۱۸۷ء۶ ملین ڈالر کی امداد دی۔ ۱۹۷۶ء میں سعودی عرب نے ۵۱۴ء۸ ملین ڈالر کی امداد فراہم کی اور ایران نے تین سو ملین ڈالر کی امداد دی قریبی برادر مسلم ملکوں کی اس امداد سے علاقائی سیاست پر اس کے دُور رس اور مثبت نتائج رُونما ہوئے جو مغربی صنعتی ملکوں کے لئے منفی نتائج کی حیثیت رکھتے تھے اور جو جنوبی ایشیا اور خاص کر بحرِ ہند کی سیاست میں ان کے سیاسی مفادات کے منافی بھی ثابت ہو سکتے تھے لہٰذا اس علاقے میں سیاسی تبدیلی لانا ضروری تھی۔

• گذشتہ گیارہ ماہ میں اس علاقے میں علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر سفارتی سرگرمیاں تیز تر ہو گئی ہیں۔ ہند چینی کی جنگ میں شکست کے بعد امریکہ کو ایشیا سے ذلیل و خوار ہو کر نکلنا پڑا تھا۔ لہٰذا اب پھر امریکہ کو ایشیا میں اپنے سابقہ "مورچوں" کی ضرورت ہے۔ اور جنوبی ایشیا کا خطہ معزبی اور سیاسی حکمتِ عملی کے اعتبار سے بہت اہم ہے اُدھر مغربی ایشیا میں بھی امریکہ اپنی ساکھ بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں مصر اور سعودی عرب کو سینٹو میں شامل کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے،

لیکن گذشتہ ماہ افغانستان میں انقلاب کے بعد خاص کر جنوبی ایشیا کی سیاست ایک نیا رُخ لیا ہے۔ علاقائی سیاست پر اس کے کیا دُور رس نتائج مرتب ہوں گے، فی الحال یہ بات واضح نہیں ہوئی ہے لیکن ایران اور پاکستان کے سفارتی حلقوں میں اسے تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ پاکستان کے امورِ خارجہ کے سکریٹری آغا شاہی نے ایران کا دورہ کیا جہاں انہوں نے افغانستان میں انقلاب کے بعد کی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ ایران میں اخباری نمائندوں سے گفتگو کے دوران انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ "اب سینٹو کو پہلے سے زیادہ سرگرم بنانے کی ضرورت ہے" ادھر ہندوستان کے وزیرِ خارجہ اٹل بہاری باجپائی نے بھی ایران کا دورہ کیا اور علاقہ کی اس نئی صورتِ حال پر ایرانی حکام سے تبادلۂ خیال کیا۔ سفارتی سرگرمیاں بدستور تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ ایران کے سفارتی حلقے اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ جنوبی ایشیا میں کسی بھی وقت زائرے جیسی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور اس جانب شہنشاہ ایران بھی بارہا نشاندہی کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں جن خدشات کا اظہار جناب بھٹو نے کیا تھا وہ بھی رفتہ رفتہ سامنے آتے جا رہے ہیں پاکستان کی بیوروکریسی نہ تو سفارتی سطح پر نئے "چیلنج" کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ ہی داخلی سطح پر سیاسی مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ اور ماضی میں ہمیں اس کا خاصا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔

بقیہ: اخباری کارکنوں کی جدوجہد

سچ یہ ہے کہ اس وقت اخباری کارکنوں کی جدوجہد کے خلاف جو دراصل جمہوریت کے حصول کی جدوجہد ہے اس وقت تین عوام دشمن طاقتوں کی تثلیث کام کر رہی ہے (۱) حکومت (۲) جماعت اسلامی اور اس کے اخبارات بالخصوص جسارت اور (۳) اخباری کارکنوں کی صفوں میں موجود مٹھی بھر غداروں اور دولت پرستوں کا ٹولہ۔ یہی تثلیث ۱۹۷۰ء میں سرگرم عمل تھی اس نے اس وقت بھی صحافیوں کی عبوری امداد کی قانونی جدوجہد کو سیاست قرار دیا تھا۔ اس ملک گیر ہڑتال کے بارے میں جو عبوری امداد کے لئے ملک گیر خفیہ رائے دہی کے بعد کی گئی تھی۔ اس تثلیث کا یہ کہنا تھا کہ یہ بھاشانی کی کال پر کی گئی ہے۔ اس کے پیچھے کمیونسٹ ہیں۔ اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ پی ایف یو جے کے رہنماؤں کے خلاف مارشل لاء کے تحت کارروائی کی جائے اسی طرح اس وقت بھی انہوں نے پی ایف یو جے اور اس کی قیادت کی کردار کشی کی بڑی بھونڈی مہم چلائی تھی انہوں نے ایک عدد غداروں کا کنونشن بھی کیا تھا اور ایک عدد مالکوں کی پاکٹ یونین این یو جے بھی بنائی تھی لیکن جلد ہی ان غداروں کو منہ کی کھانی پڑی صحافیوں نے انہیں حقارت سے مسترد کر دیا آج ایک بار پھر یہی کھیل کھیل رہے ہیں اخباری کارکن ان کے کردار سے اچھی طرح واقف ہیں یہ وہی رشید صدیقی ہیں جنہیں ہڑتال توڑنے اور این یو جے میں شامل ہونے کے جرم میں پی ایف یو جے نے دو سال کے لئے اپنی صفوں سے خارج کر دیا تھا۔ یہ دو سال کے بعد معافی مانگ کر اپنے دوسرے چند غداروں کے ساتھ تنظیم میں واپس آئے تھے۔

پی ایف یو جے نے انہیں معاف کر دیا تھا کہ شاید آئندہ یہ اپنا کردار ٹھیک کر لیں لیکن خوئے بدرا بہانۂ بسیار۔ بچھو ڈنگ مارنے سے کہاں باز رہتا ہے اس وقت ان چاروں کا یہ ٹولہ جماعت اسلامی اور حکام کی مدد سے ایک

طرف صحافت پر پابندیاں باقی رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے تو دوسری طرف یہ ایپنک اور پی ایف یو جے میں انتشار پیدا کرنے کی سعیٔ ناکام میں مبتلا ہے یہ صحافیوں اور غیر صحافیوں کی تفریق پیدا کر رہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو نسیم الحق عثمانی کے بیانات)

یہ لوگ ہمیشہ الیکشن ہارتے ہیں اس لیے ایپنک اور پی ایف یو جے کے منتخبہ اداروں مثلاً ایف ای سی اور این ای سی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے یہ اب، حکومت کی سرپرستی اور جماعت اسلامی کی قیادت میں ایک الگ پاکٹ تنظیم بنانے کی مذموم کوشش میں مصروف ہیں لیکن اخباری کارکن اب بہت باشعور ہو چکے ہیں وہ اپنے دوست اور دشمن میں اچھی طرح تمیز کرتے ہیں ان کا اتحاد اور شعور ایک بار پھر ان تمام سازشی منصوبوں کو ناکام بنا دے گا۔

قابلِ احترام ہیں وہ صحافی اور اخباری کارکن جنہوں نے آزادیٔ صحافت کے لیے قید و بند کی تمام صعوبتیں برداشت کیں۔

صد قابلِ احترام ہیں وہ صحافی جنہوں نے کوڑوں جیسی غیر انسانی سزا کو برداشت کیا اور پھر بھی معافی نامہ داخل نہیں کیا۔

قابلِ احترام ہیں وہ سینکڑوں اور ہزاروں اخباری کارکن جنہوں نے ایپنک اور پی ایف یو جے کے اتحاد کے پرچم کو بلند رکھا اور آج بھی بلند رکھے ہوئے ہیں۔

قابلِ مذمت ہیں وہ جنہوں نے تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اور اخباری کارکنوں پر ظلم کیا اور میکیاولی اور نازی ہتھکنڈے استعمال کیے اور جواب بھی کوئی سبق سیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

قابلِ صد مذمت ہے چار غداروں کا وہ ٹولہ جس نے چند مادی مفادات کے لیے اخباری کارکنوں کی آزادیٔ صحافت کی مقدس جد و جہد کو فروخت کر دیا۔

سینکڑوں مبارکباد کے قابل ہیں اس ملک کے وہ محنت کش عوام مزدور، کسان، طلباء اور دانشور اور ساری دنیا کے جمہوریت پسند اور حریت پسند عوام جنہوں نے اخباری کارکنوں کی اس جد و جہد کی حمایت کی اور جو حمایت آج بھی جاری ہے۔

ایپنک زندہ باد

پی ایف یو جے زندہ باد

پاکستان بھر کے اخباری کارکنوں کا اتحاد زندہ باد

بقیہ: سرورق

"برطانوی نوآبادکاروں نے برصغیر پر سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جو ملک کی اقتصادی ترقی میں بہت کم دلچسپی رکھتا تھا یہ بڑی حد تک کاسہ لیسوں اور طفیلیوں کا گروہ تھا انتظامیہ میں اس کی حیثیت یہ تھی کہ سفید فام آقاؤں کے دسترخوانوں سے کوئی ٹکڑا ادھر ادھر گر جاتا تو اس کے حصے میں آتا۔ اس طبقے کی اقدار اور خواہشات مغربی طرز میں ڈھل گئی تھیں۔ اس نے نوآبادکار حکمرانوں کی مجرمانہ سرگرمیاں اختیار کر لی تھیں جس سے دو طرفہ خدمات پوری ہوتیں۔ یعنی اس نے خود کو اپنے معاشرے سے اجنبی بنا لیا۔ اور ایک ایسا وسیلہ بن گیا کہ نوآبادکاری نظام کے خاتمے کے بعد بھی نوآبادکاروں کو اپنے ملک میں زیادہ سے زیادہ عرصے تک اقتصادی، سماجی اور سیاسی استحصال کی سہولتیں مہیا کرے یہ بااختیار طبقہ آج بھی جنوب مشرقی ایشیا کے ابھرتے ہوئے عوام کی گردن پر سب سے بڑا بوجھ ہے"

قیام پاکستان کے بعد بھی بیوروکریسی کی ذہنیت نہ بدلی۔ وہ "حاکموں کو سیلوٹ کرو، اور عوام سے بندوق سے بات کرو" کی پالیسی پر گامزن رہی لیکن بعد میں انگریزوں کے دسترخوان پر پلنے والی یہی بیوروکریسی حاکم مطلق بن گئی۔ لیکن یہ پریس کی قوت سے واقف تھی نپولین نے کہا تھا، "مجھے ایک اخبار دیدو میں سات سلطنتیں فتح کر دوں گا" اور اکبر الہ آبادی کی رائے تھی ؎

جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو۔

بیوروکریسی نے پہلے سیفٹی ایکٹ کی تلوار اخبارات کے سروں پر لٹکائی پھر جب ایوب خان نے توپ پر سوار ہو کر مسند اقتدار پر شب خون مارا۔ تو پہلا وار پاکستان پروگریسو پیپرز پر کیا۔ پاکستان ٹائمز، امروز، اور لیل و نہار کو سرکاری کنٹرول میں لے لیا پھر پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس کا نفاذ اور ۱۵ لاکھ روپے سے ملک کے گیارہ بڑے اخبارات کو خرید کر اور اپنی نیشنل پریس ٹرسٹ کی تحویل میں دیکر قومی پریس کو پابند سلاسل کر دیا۔ جب پورا ملک بوٹ تلے کراہ رہا تھا۔ خان قیوم معافی مانگ کر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے، مودودی، دولتانہ، پیر پگارا، مفتی محمود خاموش تھے اس وقت پی ایف یو جے نے آزادیٔ صحافت کی تحریک چلائی ۱۹۶۸ء، ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۷ء میں تحریکات چلائیں اور اب بھی پی ایف یو جے اور ایپنک آزادیٔ صحافت کے لیے تحریک چلا رہی ہے

فرنگی حکمرانوں کے دسترخوانوں کے ٹکڑے پر پلنے والی بیوروکریسی نے عوام اور عوام دوست طاقتوں پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے تحریک پاکستان کے بدترین مخالف سیاسی جماعتوں سے اشتراک اور تعاون کیا۔ اس تعاون کی وجہ یہ ہے کہ بیوروکریسی اور ان جماعتوں نے آزادی کی مخالفت کی تھی۔ انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان سب کو فرنگیوں کی کاسہ لیسی پر فخر تھا۔ ان عوام دشمن عناصر نے ہمیشہ عوام دوست افراد پر الزامات لگائے اور انہیں بدنام کیا۔ اب یہ طاقتیں پی ایف یو جے کے صدر اور ایپنک کے چیئرمین جناب منہاج برنا کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہی ہیں۔ حالانکہ جناب برنا اخباری صنعت کے کارکنوں کے غیر متنازعہ اور منتخب قائد ہیں۔ تاریخ کے ریکارڈ کے لیے یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جناب برنا متحدہ پاکستان کے زمانے میں مغربی اور مشرقی بازو کے مابین ایک سنگم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اتحاد کی علامت تھے بلاشبہ قیام پاکستان سے قبل لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر اور مولانا شبیر احمد عثمانی مشرقی بنگال کے کوٹے سے رکن دستور ساز اسمبلی منتخب ہوئے لیکن قیام پاکستان کے بعد مغربی پاکستان کا کوئی بھی سیاستدان دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ وہاں مقبول ہے، ماسوائے جناب برنا کے، جو ۱۹۶۸ء میں جب کہ عوامی لیگ چھ نکات کا اعلان کر چکی تھی۔ اور نیشنلزم عروج پر تھا۔ اس زمانے میں مشرقی پاکستان کے صحافیوں نے بنگال کے کوٹے سے جناب برنا کو پی ایف یو جے کا سیکرٹری جنرل منتخب کرایا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب جماعت اسلامی پلٹن میدان میں جلسہ کرنے کے لیے صوبائی اور مقامی انتظامیہ سے مدد لیتی تھی۔ اس کی شہادت جنرل راؤ فرمان علی سے لیجیے اردو ڈائجسٹ میں شائع شدہ یادداشت میں جنرل راؤ فرمان علی نے بتایا ہے کہ جب مودودی ڈھاکہ گئے اور پلٹن میدان میں جلسہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ تو اس موقعہ پر جلسے میں نظم و نسق برقرار رکھنے اور کامیاب بنانے کے لیے جنرل موصوف نے انتظامیہ کی خدمات پیش کی تھیں۔

اب بیوروکریسی اس جماعت سے گٹھ جوڑ کر کے نہ صرف جناب برنا کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کر رہی ہے بلکہ جھوٹے الزامات کے تحت مقدمات بھی قائم کر رہی ہے لیکن یہ لاکھ پروپیگنڈہ کریں ماضی کی طرح ناکام رہیں گے برنا نے یہ مقام جد و جہد سے حاصل کیا ہے۔

پورٹ قاسم میں کیا ہو رہا ہے

الزامات سراسر غلط ہیں: تھارٹی

ہفت روزہ راہی (۲۶ مئی تا ۲ جون ۱۹۷۸ء) میں "پورٹ قاسم میں کیا ہو رہا ہے" کے عنوان سے ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ پورٹ محمد بن قاسم اتھارٹی کے افسر تعلقات عامہ نے ہماری رپورٹ کی تردید کرتے ہوئے ایک خط بھیجا ہے جو درج ذیل ہے۔ لیکن ہمارا اصرار ہے کہ ہماری مذکورہ رپورٹ حقائق پر مبنی تھی۔ چنانچہ تردیدی خط شائع کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ہم اس ادارے میں ہونے والی بدعنوانیوں کے بارے میں مزید حقائق شائع کر رہے ہیں ——— (ادارہ)

پورٹ محمد بن قاسم اتھارٹی

نمبر پی اواے / پی آر / ۵۰۰۳/۷۸
مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۷۸ء

جناب ایڈیٹر صاحب
ہفت روزہ "راہی"
حیدرآباد

جناب عالی!

میں آپ کی توجہ ایک مضمون کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جو آپ کے ہفت روزہ بابت ۲۶ مئی ۱۹۷۸ء تا ۲ جون ۱۹۷۸ء میں "پورٹ قاسم میں کیا ہو رہا ہے" کے عنوان کے تحت پورٹ محمد بن قاسم کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ "قومی اہمیت کے اس بڑے منصوبے" کے بارے میں اطلاعات شائع کرتے ہوئے ایسی خبریں دی گئی ہیں جو غلط اور مسخ شدہ ہیں، جس کا متعصبانہ مقصد اتھارٹی اور خاص طور پر اس کے چیئرمین کو بدنام کرنا ہے۔

یہ الزام غلط ہے کہ چند افسروں کو چیئرمین سے ان کے ذاتی روابط کی وجہ سے مراعات دی گئی ہیں۔ حقیقتاً مضمون میں مذکورہ افسروں کی تقرری اور ترقی معمول کے مطابق ہوئی ہے۔ یہ اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ ان کی تقرری اور ترقی کو کسی بھی فرد نے کسی بھی مرحلے پر چیلنج نہیں کیا ہے۔ جہاں تک نان میٹرک خاتون کے تقرر اور پیشگیاں دینے کا تعلق ہے یہ ایک بے بنیاد کہانی ہے کیونکہ ایسی کوئی خاتون اس وقت اس ادارے میں موجود نہیں۔ چند افسروں نے ایک خاتون ٹائپسٹ کو بھرتی کیا تھا۔ ان سب کو خراب کارکردگی کی وجہ سے اتھارٹی کی ملازمت چھوڑنی پڑی ہم اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ وہ خاتون جو اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ قائمقام سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہی ہیں ایک تعلیم یافتہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔ وہ نہ صرف ایم۔ اے ہیں بلکہ لائبریری مینجمنٹ میں ڈپلومہ بھی رکھتی ہیں۔ سیکرٹری کے استعفیٰ کی وجہ سے انہیں تفویض کئے جانے والے اضافی فرائض کی نوعیت عارضی ہے۔ جیسا کہ ایسے مواقع پر ہوتا ہے۔ سیکرٹری کی اسامی خالی ہے جس کے لئے مختلف موقر روزناموں میں اشتہار کے ذریعے درخواستیں پہلے ہی طلب کی جا چکی ہیں۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے۔

مسٹر زیڈ۔ اے۔ ڈی۔ عابد پاکستان نیوی کے ریٹائرڈ کموڈور ہیں۔ وہ اپنے انجنیئرنگ اسپیشلٹی کے میدان میں اپنی ذمہ داریاں اور فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں تفویض کئے جانے والے دوسرے فرائض بھی ادا کرتے رہے ہیں۔

اسی طرح مسٹر مظہر محمود کے بارے میں بھی بے بنیاد الزامات لگائے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک ریٹائرڈ نیول کیپٹن ہیں جو پورٹ ایڈمنسٹریشن میں علم اور تجربہ رکھتے ہیں اور اسی حیثیت میں وہ ملک سے باہر بھی کام کرتے رہے ہیں۔ مسٹر ایم عاشق سرہندی پاک آرمی میں میجر تھے اور طویل انتظامی تجربہ رکھتے ہیں۔

مسٹر جمیل احمد صدیقی جرمنی کے پوسٹ گریجویٹ ہیں اور جہاز رانی کے میدان میں ۱۳ سال کی طویل مدت تک غیر ممالک میں کام کیا ہے اور ایک باصلاحیت اور ذمہ دار شخص ہیں۔

مسٹر ایم عمر پی او اے میں آنے سے پہلے پاکستان میرین اکیڈمی میں ایڈمنسٹریٹو آفیسر تھے اور مسٹر ایم اے مجید کراچی پورٹ ٹرسٹ میں اکاؤنٹنٹس آفیسر تھے مذکورہ بالا افسروں کے گریڈ کے بارے میں معلومات بھی درست نہیں ہیں۔

ڈائریکٹر (اسٹورس) مسٹر ایم یعقوب خان اور ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر ضیاء الحق دھوکہ دہی کے کسی معاملے میں ملوث نہیں ہیں اور ان کے خلاف کوئی تحقیقات نہیں ہو رہی ہیں۔ یہ ایک بدنام کرنے والا الزام ہے مذکورہ بالا تمام افراد بہت تجربہ کار ہیں اور اپنے فرائض میں مستعد ہیں۔

۱۳ برخاست شدہ افسروں کے بارے میں حقائق یہ ہیں کہ انہیں اعلیٰ حکام کی ہدایت پر ملازمت سے برخاست کیا گیا ہے کیونکہ مارشل لاء اتھارٹی کے نتیجے میں ان کی اسامیوں کو نام بہ نام فاضل قرار دیا گیا تھا۔ وہ بے دقعت، نااہل، ناقابلِ اعتبار، غیر مستعد اور کام چور کارکن تھے۔ وہ اس کام کے لئے موزوں نہیں تھے جو ان کے ذمے کیا گیا تھا۔ چند مثالیں دینے کے لئے:-

مسٹر مظفر علی شاہ جیلانی۔ پورٹ قاسم کی ملازمت میں گریڈ۔ ۱۹ میں ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن کی حیثیت میں مسلط کئے گئے تھے۔ انہیں اسی طرح گریڈ ۱۸ میں ڈپٹی ڈائریکٹر ایگریکلچر مقرر کیا گیا تھا کیونکہ ان کے والد مسٹر قائم علی شاہ وزیر تھے۔ اتفاق یہ کہ مسٹر قائم علی شاہ کے نااہل قرار دیئے جانے کی ایک وجہ مسٹر مظفر علی شاہ کا حکومت سندھ میں بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر تقرر ہے۔ مسٹر مظفر علی شاہ نے کچھ عرصے کے لئے بیک فاؤنڈیشن میں کام کیا تھا۔ ان میں اس علم اور تجربے کی کمی تھی جو اس اعلیٰ عہدے کے لئے ضروری تھا جو انہیں اچانک تفویض کیا گیا تھا انہیں ایک نااہل اور ایسے عہدے کے لئے ناموزوں شخص پایا گیا۔ وہ اس تقرر کے کبھی بھی مستحق نہیں تھے۔

مسٹر فقیر اسحاق علی حبانی: انہیں ڈپٹی ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن کی حیثیت میں گریڈ ۱۸۔ عطا کیا گیا تھا۔ وہ سندھ یونیورسٹی کے ایک تازہ گریجویٹ تھے۔ بالکل نئے، ناتجربہ کار، خط لکھنے کے ناقابل اور فائل پر معمولی منٹس تک نہ لکھ سکنے والے۔ ایک مکمل طور پر ناکام۔ راہرو اور اتھارٹی کے لئے فضول خرچی تھے۔ یہ بعد میں گریڈ۔ ۱۹ کے افسر بن گئے۔

مسٹر خان محمد بھٹی: ٹیکنیکل ڈیپارٹمنٹ میں اپر ڈویژن کلرک تھے۔ انہیں بھی گریڈ۔ ۱۸ میں ڈپٹی سیکریٹری

قاسم پورٹ اتھارٹی

جواب حاضر ہے

نمائندہ خصوصی

پورٹ محمد بن قاسم اتھارٹی کا تردیدی اور وضاحتی مراسلہ آپ نے گزشتہ صفحات پر ملاحظہ فرمایا۔ آزادی صحافت اور صحافتی دیانتداری کا تقاضا تھا کہ پورٹ قاسم کی وضاحت شائع کی جاتی، جو ہم نے کردی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے مضمون "پورٹ قاسم میں کیا ہو رہا ہے" میں بیان کردہ حقائق کو غلط تسلیم کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری فراہم کردہ اطلاعات میں بعض فروعی اور غیر اہم تفصیلات سو فیصد درست نہ ہوں۔ لیکن جہاں تک بنیادی مسئلے کا تعلق ہے وہ حرف بہ حرف درست ہیں چند مثالیں ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

اتھارٹی کی طرف سے وضاحت میں قائم مقام سیکریٹری خاتون کا ذکر آپ پڑھ چکے ہیں ہم اسے واقعات اور شہادت کی بنیاد پر درست نہیں مانتے۔ یہ حقائق خود چیئرمین صاحب کے علم میں بھی تحریری طور پر لائے جا چکے تھے مس حمیدہ روحی بانو کا تقرر ۱۹۷۵ء میں اسسٹنٹ کی حیثیت

ٹھیکے دار کے استقبالئے میں اتھارٹی کی ٹرانسپورٹ کس کے حکم پر استعمال کی گئی

کی حیثیت میں پی اواے پر مسلط کیا گیا تھا۔ اس شخص کی صلاحیت کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک کلرک کی صلاحیت رکھتے تھے۔

مسٹر محمد عبداللہ شیخ: انہیں سابق وزیر اعظم کی ہدایت کے تحت گریڈ۔ ۱۷ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے لئے اسسٹنٹ ڈائریکٹر میڈیکل کی ایک آسامی وضع کی گئی تھی۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ڈوڈا خاں عالمانی اور عبدالستار قایہ کھو صاحبان: انہیں بالترتیب اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائریکٹر ٹریفک کی حیثیت سے اتھارٹی میں دھکیلا گیا تھا۔ حالانکہ وہ پورٹ ٹریفک کے تجربے کے حامل نہیں تھے۔ انہیں ٹریننگ کے لئے کے پی ٹی بھیجا گیا لیکن انہوں نے کوئی ترقی نہیں ظاہر کی۔ انہیں کئی ٹریننگ اور سیمیناروں میں شرکت کے لئے نامزد کیا گیا۔ لیکن سب بیکار گیا۔ انہوں نے ہر موقعے پر خود کو نا اہل اور کام چور کارکن ثابت کیا۔

مسٹر شوکت حیات دریانی: سابق اسسٹنٹ ڈائریکٹر ان کو مختلف شعبوں میں کام کرنے کے کئی مواقع دیئے گئے لیکن انہوں نے ان کے ذمے کئے جانے والے کام میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اس طرح انہوں نے خود کو گریڈ ۱۷ کی افسری کے لئے ناموزوں ثابت کیا۔

نا اہل افسروں کی حالیہ بھرتی کا الزام سراسر بے بنیاد ہے یہ تقرریاں سینیئر افسروں پر مشتمل پی' ایم' پی' او' اے کی سلیکشن کمیٹی کی سفارشات پر کی جاتی ہیں۔ جو امیدواروں کے تعلیمی پس منظر / تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی رپورٹیں پی' او' اے بورڈ کو پیش کرتے ہیں۔ جو ان تقرریوں کی منظوری دیتا ہے۔

ٹھیکیداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کا الزام بھی جھوٹا اور بدنیتی پر مبنی ہے کیونکہ لیولنگ اور گریڈنگ کے مذکورہ ٹھیکے کے لئے قاعدے کے مطابق ٹینڈر طلب کئے گئے تھے اور کم سے کم والے ٹھیکیدار کو کام کا ٹھیکہ دیا۔

کچھ عرصہ پہلے ایک ٹھیکیدار نے اپنے اسٹاف اور مزدوروں کو ایک دعوت دینے کے لئے ایریا میں کچھ جگہ استعمال کرنے کی اجازت انتظامیہ سے مانگی تھی اور اس نے پی او اے کے اسٹاف اور افسروں کو بھی دعوت دی تھی کہ اگر وہ پسند کریں تو شریک ہوں۔ یہ دعوت نامہ بورڈ پر لگایا گیا تھا اور بہت سے لوگوں نے اس میں شرکت کی تھی۔

سے ۲۷۵-۲۰-۲۷۵-۲۰۰-۴۷۵-۲۵-۶۰۰ کے گریڈ میں کیا گیا تھا اس کے بعد انہیں ترقی دیکر ۳۷۵-۲۵-۵۰۰-۳۰-۶۵۰-۳۵-۸۲۵ کے گریڈ میں اسسٹنٹ بنا دیا گیا اسسٹنٹ کی حیثیت سے سینیارٹی میں ان کا نمبر ۱۱ تھا۔ اس کے بعد دوسرے سینیئر اسسٹنٹوں کو نظر انداز کرکے انہیں گریڈ ۱۷، ۹۰۰-۵۰-۱۱۵۰-۶۰-۱۷۵۰ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر (لائبریری) کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اس ترقی سے قبل کسی باقاعدہ انتخاب کے بغیر انہیں نیپا میں آٹھ ماہ کا لائبریری کورس کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا اگر اسی گریڈ کے دوسرے سینئر اسسٹنٹوں کو اس تربیت اور اس کے نتیجے میں ملنے والی ترقی کی اطلاع ہوتی وہ یقیناً اسے قبول کر لیتے۔ اور اپنی اہلیت کی بنیاد پر منتخب ہو جاتے انہیں اپنے حق سے محروم رکھنے کے لیے اس بات کو ظاہر نہیں کیا گیا تھا جانبداری اور ناانصافی نہیں تو پھر کیا ہے۔

جہاں تک محترمہ حمیدہ روحی بانو کی کارکردگی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں پی ایم پی اڈاے کے چیئرمین کی اس رائے سے ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے مراسلے نمبر پی ادا ے سی. ایم/۱۰۱/۷۵/۷۶۷ مورخہ ، مئی ۱۹۷۵ء میں ظاہر کی "پی ادا ے رلیپنٹ معیار کے مطابق نہیں ہے بدقسمتی سے ہماری رلیپنٹ قطعی متاثر نہیں کرتیں حقیقت یہ ہے کہ تاثر منفی ہوتا ہے۔"

اسی طرح مس روحی بانو کے سلسلے میں نیپا کے اپنے مراسلے نمبر ۱۶/۴/۶۶/ نیپا مورخہ ۲۰ راپریل ۱۹۷۷ء کے متن سے ان کی کارکردگی کا پتہ چلتا ہے جس میں ان کی دوران تربیت حاصل کردہ صلاحیت کو ناکافی قرار دیتے ہوئے تجویز کیا گیا کہ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ یونیورسٹی میں باقاعدہ لائبریری سائنس کورس میں شرکت کریں موجودہ تجربے اور علم کی بنیاد پر انہیں کسی تجربہ کار لائبریرین کے اسسٹنٹ کے طور پر بھی کام کرنے کے لیے ناموزوں قرار دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اسسٹنٹ ڈائریکٹر (لائبریری) بنائی گئیں۔ انہیں گریڈ نمبر ۱۱ سے براہ راست گریڈ ۱۷ میں ترقی دی گئی۔ اور وہ کسی سلیکشن کمیٹی کے سامنے بھی پیش نہیں ہوتیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کے لیے بورڈ کی منظوری بھی حاصل نہیں کی گئی تھی انہیں قائم مقام سیکریٹری مقرر کرتے وقت بھی چیئرمین کے سیکریٹریٹ میں کام کرنے والے کئی سینیئر اور تجربہ کار افسروں کو نظر انداز کرکے انہیں موقعہ دیا۔

مسٹر عابد کا تقرر ۹ مارچ ۱۹۷۷ء کو عمل میں آیا اس کے بعد سے اب تک کے مختصر عرصے میں وہ بلا کسی مقصد کے دو بار انگلستان کا دورہ کر چکے ہیں انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اتھارٹی کے تمام افسروں کے پورٹ منتقل ہو جانے کے بعد بھی ان کی ضعیفی کے پیش نظر ان کے لیے این ایل سی بلڈنگ کی پانچویں منزل زیر استعمال رکھی گئی ہے اس کا بھاری کرایہ اس لیے ادا کیا جا رہا ہے کہ انہیں شہر میں ایئرکنڈیشنڈ دفتر کی سہولت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے روزانہ اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتے ان کے دفتر کی کارکردگی کے معائنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ وہ کوئی کام سرانجام نہیں دے رہے۔ وہ تنہا افسر ہیں جنہیں اپنا گھریلو سامان لاہور سے لانے کے لیے کرایہ ادا کیا گیا ہے اور کراچی سے لاہور واپس جاتے وقت بھی شاید ادا کیا جائے گا جب کوئی افسر کسی معاہدے کے تحت ملازمت میں آتا ہے۔ تو معاہدے کی مدت کے دوران اس کی تنخواہ اور الاؤنسوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ خود اتھارٹی کا بھی یہی موقف ہے جو اس نے اسٹیوارڈ نظیر احمد کے معاملے میں اختیار کیا تھا۔ لیکن عابد صاحب کے سلسلے میں یہ اصول توڑ دیا گیا۔ اور انہیں اردلی الاؤنس کی بھی منظوری دی گئی

مسٹر جمیل احمد صدیقی کے بارے میں یہ بات قطعی غلط ہے کہ وہ ہیمبرگ (مغربی جرمنی) کے پوسٹ گریجویٹ ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس ہیمبرگ کی اس کمپنی کا ڈپلومہ ہے جس میں انہوں نے کلرک کی حیثیت سے کام کیا تھا اور جہاں سے انہیں معقول وجوہات کی بنا پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ اور مبینہ طور پر انہیں اپنے رویے کی بنا پر جرمنی سے نکال دیا گیا تھا۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے صرف بی اے پاس کیا ہے اور کسی سابقہ تجربے کے حامل نہیں ہیں۔ اس کی تصدیق مراسلہ نمبر پی ادا ے/ اسٹیبلشمنٹ/۲۸۰/۷۷ بابتہ ۱۹۷۸ء کے منسلکہ سے ہوتی ہے انہیں وفاقی حکومت کے ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گریڈ ۲۰ میں براہ راست او ایس ڈی مقرر کیا گیا تھا۔ سلیکشن کمیٹی نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ گریڈ ۲۰ میں تقرر فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے توسط سے ہوتا ہے لیکن چیئرمین نے نہ صرف انہیں گریڈ ۲۰ میں تقرر کیا بلکہ اس گریڈ میں زیادہ سے زیادہ تنخواہ بھی دی۔ اس اسامی کو مشتہر تک نہیں کیا گیا تھا۔ بعد میں اس اسامی کو ڈائریکٹر (ٹریفک) کا نام دے دیا گیا۔ موصوف کی کند ذہنی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کئی بار ملک سے باہر تربیت اور سیمیناروں میں شرکت کی غرض سے جانے کے باوجود خود اتھارٹی انہیں اس قابل نہیں سمجھتی کہ وہ باہر سے آنے والی ٹیموں مثلاً ایشین ڈیولپمنٹ بنک وغیرہ سے سامنا کر سکیں

ٹھیکیدار کی طرف سے دعوت دینے کو اتھارٹی غلط الزام قرار دیتی ہے اور اس کا موقف آپ نے ملاحظہ کر لیا اب حقیقت بھی ملاحظہ فرمایئے ایک سرکلر ہے جو حرف بحرف نقل کیا جا رہا ہے۔

<u>پورٹ محمد بن قاسم اتھارٹی</u>

نمبر پی ادا ے/۲۳/۷۷ مورخہ ۱۲-۱۲-۷۷ء

<u>سرکلر</u>

شیخ محمد امین پورٹ محمد بن قاسم کے تمام ملازمین کے لیے "بتاریخ ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو لنچ کے وقفے میں (یعنی ایک بجے دوپہر سے ڈیڑھ بجے تک) ایک "تقریب" منعقد کر رہے ہیں

وہ اس مقصد کے لیے مین آفس بلڈنگ سے متصل شامیانوں کا بندوبست کر رہے ہیں۔

تمام لوگوں اور ہر ایک کو مسرت کے ساتھ مدعو کیا جا رہا ہے۔

شرح دستخط

(ایم اے ایم۔ سرہندی)

ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)

(نوٹس بورڈ ز۔ سائٹ اور این ایل سی بلڈنگ)

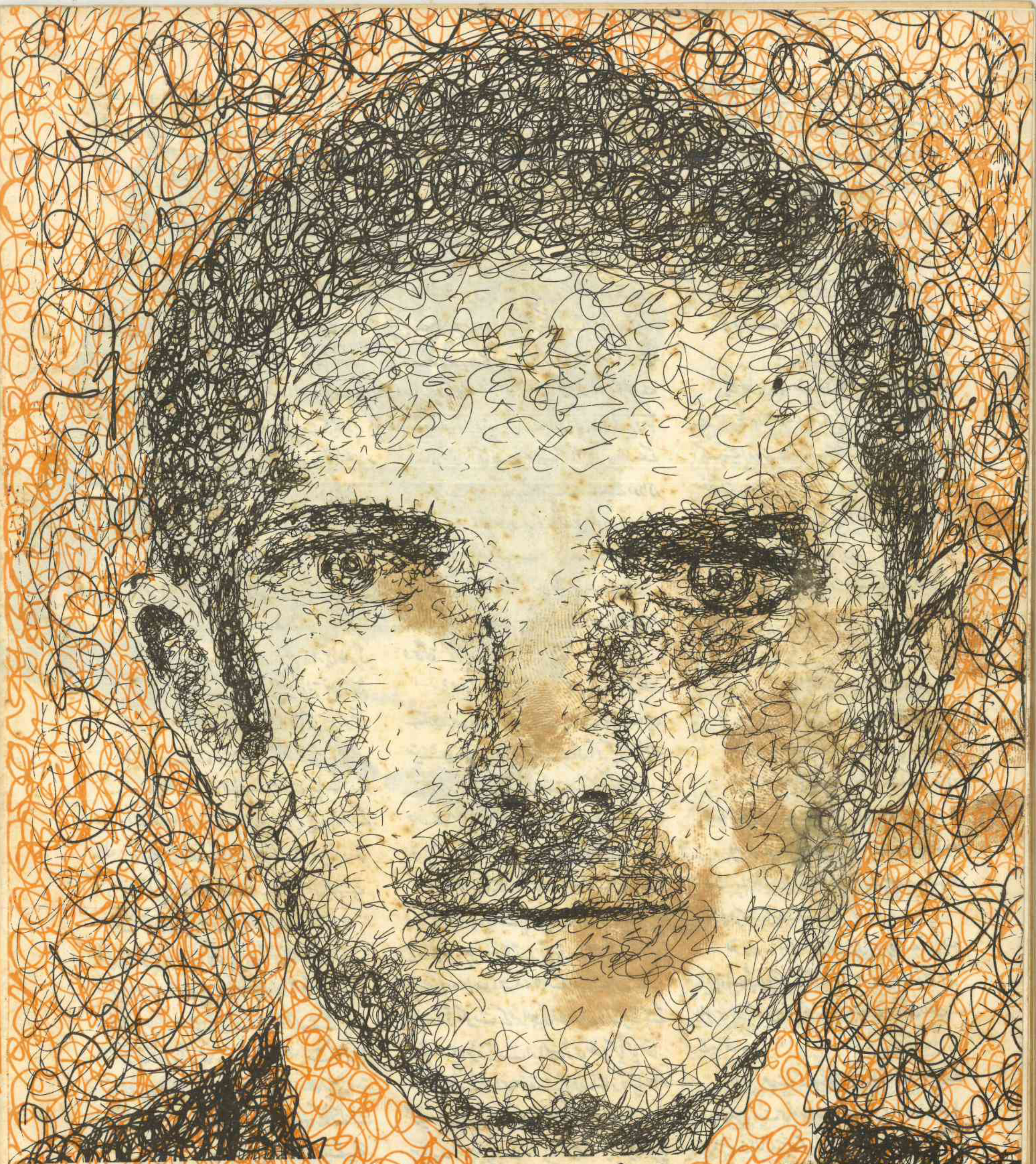
تمام شعبوں کے سربراہ ! اس درخواست کے ساتھ ان کے ساتھ کام کرنے والے تمام ملازمین کو مطلع کریں.

ایم۔ ٹی۔ او۔ ملازمین کو ۱۴-۱۲-۷۷ء کو بارہ بجکر ۴۵ منٹ پر اسٹورس / ایڈمنسٹریشن بلاک پہنچانے کے لیے گاڑیوں کا بندوبست کرنے کی غرض سے۔

نقول :۔ ۱۔ پی ایس ٹو چیئرمین ۲۔ پی اے ٹو (ٹریفک) ۳۔ پی اے ٹو پروجیکٹ ڈائریکٹر ۴۔ جی۔ ایم (ایڈمن) این ایل سی بلڈنگ میں تمام ملازمین کو اطلاع دینے کی درخواست کے ساتھ۔

(اس دعوت کے بعد ٹھیکیدار کو کیا فوائد حاصل ہوئے اور دوسری بہت سی تفصیلات ہمارے پاس موجود اور محفوظ ہیں جنہیں فی الحال پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے)

آخر میں ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ الزام لگانا نہ ہماری پالیسی ہے نہ مقصد ہے ہم صرف ناانصافیوں اور بے قاعدگیوں کا خاتمہ چاہتے ہیں اتھارٹی کے لیے مناسب یہی ہے کہ غیر اطمینان بخش صفائیاں پیش کرنے کی بجائے اصل خرابیوں کو دور کرے اسی میں سب کی بہتری ہے۔



افغانستان کا انقلاب

سیاست کا رخ بدل گیا ہے